بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا

ہم نے اسکو (بھلائی برائی پر مطلع کر کے) رستہ بتلا دیا (پھر) یا تو وہ شکر گزار (اور مومن) ہو گیا یا پھر ناشکرا (اور کافر) ہو گیا۔

(سورۃ الدھر آیۃ: ۳)

دنیوی و اُخروی فلاح کا ضامن

پاکیزہ معاشرہ

مؤلفہ

الحاج شیخ محمد حبیب الرحمٰن

(بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی)

ناشر

ادارۂ نقشبندیہ اویسیہ چکوال

دُعا

اے اللہ! تو میرے دین کی اصلاح فرما جو	اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ
میرے ہر کام کی حفاظت کرنیوالی چیز ہے	هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ۔
اور میری دُنیاوی اصلاح فرمادے جس	وَاَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا
سے میری معاش متعلق ہے۔	مَعَاشِيْ۔
اور میری آخرت کو ٹھیک کردے، جہاں	وَاَصْلِحْ لِيْ اٰخِرَتِيَ الَّتِيْ فِيْهَا
مجھے مر کر جانا ہے۔	مَعَادِيْ۔
اور میری زندگی کو میری ہر ایک بھلائی کی	وَاجْعَلِ الْحَيٰوةَ زِيَادَةً لِّيْ
زیادتی کا سبب بنادے۔	فِيْ كُلِّ خَيْرٍ
اور موت کو راحت کا سبب بنادے	وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ
ہر ایک بُرائی سے۔	مِنْ كُلِّ شَرٍّ (مسلم شریف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا

—— قرآن کریم ——

دُنیوی و اُخروی فلاح کا ضامن

پاکیزہ معاشرہ

—— مؤلفہ ——

الحاج شیخ محمد حبیب الرحمٰن

بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

—— ناشر ——

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ چکوال

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقعہ پر
حضرت خدیجہؓ نے فرمایا:

" ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ

◎ تعلقات جوڑتے ہیں ◎ ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں

◎ جو چیز دوسرے کے پاس نہیں آپ انہیں کما کر دیتے ہیں ◎ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں

◎ حادثات کے شکار لوگوں کے حقوق دلانے میں انکی مدد کرتے ہیں۔

(بخاری شریف)

نام کتاب	پاکیزہ معاشرہ
ناشر	ادارہ نقشبندیہ اویسیہ نیا محلہ چکوال (ضلع جہلم)
مطبع	محبوب پرنٹنگ کارپوریشن ۹ سرکلر روڈ لاہور
مقصد اشاعت	اصلاح معاشرہ و تبلیغ دین
تعداد	ایک ہزار
بار	اوّل - اکتوبر ۱۹۷۹ء

ملنے کے پتے

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ - نیا محلہ - چکوال ضلع لاہور
مرکز ذکر - ۱۷ نیو چوبرجی پارک (اے بلاک)، لاہور
دفتر انجمن سماجی بہبود - نیو چوبرجی پارک (اے بلاک) لاہور

فہرست

انتساب

استاذ مکرم مجدد طریقت حضرت العلام

مولنا اللہ یار خانصاحب دامت برکاتہم

کے نام

جنکے فیض روحانی اور سخاوت سے ہزاروں خدا شناسوں

کو معرفت الہٰی کی نعمت عطا ہوئی اور ہو رہی ہے -

اور

جنکے خلوص و محبت نے والدین کے لئے راہِ نجات اور

بندہ کے لئے راہ سلوک کا شرف بخشا -

حبیب الرحمٰن

" تو جو امتیں تم سے پہلے ہو گذری ہیں ان میں ایسے سمجھدار (اہل خیر) لوگ کیوں نہ ہوئے جو کہ (دوسروں کو) ملک میں فساد پھیلانے سے روکتے، بجز چند آدمیوں کے جنکو ان میں سے ہم نے (عذاب سے) بچا لیا تھا - اور جو لوگ نافرمان تھے وہ اسی عیش کے پیچھے پڑے رہے جو انہیں دیا گیا تھا اور (وہ) جرائم کے خوگر ہو گئے - اور آپ (اے نبیؐ) آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو بلا وجہ ہلاک کر دے (جبکہ) ان بستیوں کے رہنے والے (اپنی اور دوسروں کی) اصلاح کرنے میں لگے ہوں ـ"

(سورہ ہود آیت ۱۱۶/۱۱۷)

تعارف

کسی معاشرہ کے افراد کے سامنے کوئی بلند نصب العین ہو اور اس نصب العین کے حصول کے لئے دلی لگن کے ساتھ احساسِ ذمہ داری سے کام کرنے کا جذبہ ہو، اور زندگی کے ہر شعبہ میں انسانی اقدار کو ملحوظ رکھنے کا اہتمام ہو تو اسے پاکیزہ معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ جب افراد میں کسی نوعیت کا بگاڑ پیدا ہو جائے تو اسے بگڑا ہوا معاشرہ کہتے ہیں۔

کسی معاشرے کی اصلاح کے لئے بگاڑ کا سبب معلوم کرنا اور معاشرے میں ان اسباب کے راہ پانے کی صورتیں ڈھونڈ لینا اصلاح کا بنیادی تقاضا ہے اس تشخیص کے دو طریقے ہیں۔ اوّل یہ کہ علمی حقائق سامنے رکھکر استدلال کے رنگ میں نظریاتی بحث و تمحیص کرنا۔ یہ صورت علمی حد تک بڑی خوش کن ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بگاڑ کی جو عملی شکلیں افراد میں ظاہر ہوتی ہیں، ان کی مدد سے علمی اور عملی خرابیاں معلوم کی جائیں۔ مگر یہ کام کرسی اور میز کی مدد سے کرنے کا نہیں۔

اِس کتاب کے مصنف کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ محکمہ پولیس کے اعلےٰ افسر رہے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد سے براہِ راست معاملہ رہا۔ مجرمانہ ذہنیت کی نفسیاتی الجھنوں سے فرد کی عملی زندگی میں جو مد و جزر آتا ہے، ان کا واسطہ عمر بھر اِس سے رہا۔ پھر ملزم اور مجرم کے درمیان جو فاصلہ ہے اسے بڑھانے یا کم کرنے کی کوششیں جس انداز سے ہوتی ہیں وہ بھی اُنکے تجربے کا ایک حصہ ہے۔

چنانچہ بگاڑ کی تشخیص میں اپنے ملک اور دوسرے ممالک کے جرائم کے اعداد و شمار جو دیئے گئے ہیں یہ اسی فنی مہارت اور تجربے کا ثبوت ہے۔

مصنف کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس بگاڑ کی تشخیص کے بعد اصلاح کا جو قدم اٹھایا ہے اس کے لئے آپ نے انسانی کاوشوں پر نگاہ نہیں جمائی کیونکہ وہ اسے عطائی کی حیثیت دیتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے خالق انسان اور اس کے آخری رسول صلے اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کی طرف رجوع کیا۔ علاج کی تدبیروں کو دیکھا جائے تو یہاں ان کا تیسرا وصف یہ نظر آتا ہے کہ صرف اسلام دوست ہی نہیں بلکہ عملی مسلمان ہیں جسے دوسرے لفظوں میں مسلمان صوفی کہا جاسکتا ہے۔

کتاب کے آخر میں آپنے جو خلاصہ دیا ہے اس سے تو انکی ایک اور خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مشفق استاد کبھی سبق پڑھا دینے پر اکتفا نہیں کیا کرتا بلکہ اس کا اعادہ بھی کرتا ہے تاکہ شاگرد کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے۔ گو آپ مدرس رہے ہیں نہ پروفیسر مگر یہ مشفقانہ رویہ اساتذہ ہی کی خصوصیت ہے۔ مگر قدرت جسے طبع سلیم عطا کر دے اس سے ایسا کام بھی لے لیتی ہے جو بالکل نرالے اور نادر ہوتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انکی اس کوشش کو قبول فرمائے اور معاشرے کے لئے نشانِ راہ کا کام دے۔

وللہ الحمد وھو ولی التوفیق

پروفیسر حافظ عبدالرزاق ایم اے

الحسنات منزل۔ نیا محلہ

چکوال

حرف اوّل

"جیسے ہی ثقافتی طائفے کے ناچ گانے کا پروگرام ختم ہوتا ہے اسی ہال میں مصلّے بچھا دیئے جاتے ہیں۔ ایک حافظ صاحب تشریف لاتے ہیں جو تمام فنکاروں کو نماز پڑھاتے ہیں۔ اور پھر درس دیتے ہیں۔ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد مصلّے دوبارہ لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور فضا ایک بار پھر پائل کی جھنکاروں اور اڑتی ہوئی تانوں سے گونجنے لگتی ہے۔"

دین و دنیا سے محبت کا یہ کیسا لطیف انداز ہے۔ نہ دنیا کی لذتوں سے محرومی کا خدشہ اور نہ ہاتھ سے جنت کے جانے کا غم۔ اِس ترقی یافتہ دور میں ایسے نت نئے ڈرامے کھیلنا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ مغربی تعلیم و تہذیب کی چمک دمک سے متاثرہ طبقے کا یہی وہ رجحان اور فکر و نظر ہے جو برائیوں سے پاک معاشرے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیتا۔ معاشرتی برائیوں کی داستانیں آج ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ انتشار، بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس عام ہے۔ لاقانونیت کا سلسلہ صرف جرائم پیشہ عناصر تک محدود نہیں بلکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں جو بدعنوان عناصر کی دست برد سے محفوظ ہو۔ اور اب تو نظم و ضبط کے فقدان، بداخلاقی اور بدمعاملگی نے ایسی بھیانک صورت اختیار کر لی ہے کہ عوام اِس خیال کا برملا اظہار کرنے لگے ہیں

کہ اصلاحِ معاشرہ کسی کے بس کی بات نہیں رہی - یہ کس قدر عظیم المیہ ہے -

ہمارے پیشِ نظر یہی وہ صورتِ حال تھی جو برائیوں سے پاک معاشرے کے قیام کے لئے روحانی نظریہ پیش کرنے کی محرک ہوئی - پندرہ سال بیشتر ۱۹۶۴ء میں جب کہ میں پولیس ٹریننگ کالج سہالہ میں بطور لاء انسٹرکٹر متعینات تھا تو کالج کے تقریباً ایک ہزار پولیس افسران اعلےٰ اور ممبران سٹاف کو خطاب کرنے کا ایک موقعہ ہاتھ آیا - میری تقریر کا موضوع تھا : " ارتکاب جرائم غیر روحانی اندازِ فکر کا نتیجہ ہے "۔ یہ نظریہ جتنا انوکھا تھا اتنا ہی دلپذیر بھی تھا، بہت سراہا گیا - زیرِ تربیت پولیس افسران تو جیسے ایک خوابِ گراں سے چونک ہی پڑے - تقریر کے بعد ان کا یہ تاثر تھا کہ کیا آخرت میں اعمال کی جوابدہی کے تصور اور سزا و جزا کے پیشِ نظر، پولیس کی ملازمت کرنا ان کے لئے مناسب بھی ہے یا نہیں - درحقیقت یہ ان کے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی تھی اور یہی ایمان کا تقاضا بھی تھا -

دراصل بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے یہ زمین کثافت اور گندگی کے لئے نہیں بنائی - اِس میں بسنے والوں کے لئے "عبادی الصالحین" اور "عباد اللہ المخلصین" کی شرط لگا دی گئی ہے - بنی اسرائیل کا انجام ہمارے سامنے ہے - جب انھوں نے اللہ تعالےٰ کے احکام کی نافرمانی کی، اسکی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اپنے ظلم و عصیاں سے ارضِ الٰہی کی طہارت کو داغدار کیا تو ان کو ربِ ذوالجلال کے غضب نے آپکڑا - چنانچہ ذلت اور محتاجی ان کا مقدر بن گئی -

پھر زمینِ حجاز سے ایک نئی امت کو منتخب کر کے منصب خلافت پر سرفراز فرمایا گیا - لیکن ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی گئی

"اور بنی اسرائیل کے بعد ہم نے تم کو زمین کی وراثت دی تاکہ دیکھیں کہ تمہارے اعمال کیسے ہوتے ہیں۔" (قرآن کریم)

تاریخ شاہد ہے کہ امتِ مسلمہ جب تک منشائے الٰہی کے مطابق خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ عمل پیرا رہی وہ عزت و کامرانی سے سربلند رہی لیکن جب منصبِ خلافت کی قدر نہ پہچانی، دینِ فطرت کے اصولوں سے روگردانی کی اور ہوائے نفس کی گمراہی میں مبتلا ہوئے تو وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے۔ چنانچہ یہ خدائی وعید ان پر بھی صادق آئی۔

"پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے خدا کی عبادت کو ضائع کر دیا اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ پس بہت جلد ان کی گمراہی ان کے آگے آئے گی۔"

یہی وجہ ہے کہ آج خدا کی یہ زمین نافرمانیوں کی ظلمت سے تاریک نظر آتی ہے۔ اس پس منظر میں ہم نے اصلاحِ معاشرہ کے اپنے روحانی نظریہ کو مزید استدلال کے ساتھ اس رسالہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک مستحکم اور واضح بنیاد فراہم کی جاسکے۔ اب "نظامِ مصطفےٰ" کی تحریک کے پیشِ نظر یہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں لایا جائے جس میں نیکیاں کرنا آسان ہو اور برائیاں کرنا سخت مشکل ہو۔ جس میں اچھائیوں کا بول بالا ہو۔ فلاح و خوش حالی عام ہو، امن و امان ہو لیکن برائیوں پر کوئی کسی کو مجبور نہ کر سکے، لہٰذا اِس مقصد کے حصول کے لئے وعظ و نصیحت یا اسلامی سزاؤں کے نفاذ پر اکتفا کرنا کافی نہ ہوگا بلکہ افراد کو مثالی انسان بنانے کی باقاعدہ تربیت دینا ہوگی اور ان کو برائیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے نیکیوں کی ترغیب دینے کا ایک

جامع عملی منصوبہ مرتب کرنا ہوگا۔ تاکہ اجتماعی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جاسکے اور ان محرکات کا قلع قمع کیا جاسکے جن سے یہ برائیاں جنم لیتی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس منزل کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اعضاء و جوارح کو خیر کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ذکرِ الٰہی کے ذریعہ دلوں کی سیاہیاں دھو ڈالنے کو اولیت دی جائے۔ کیونکہ جذبات کی تطہیر کے بغیر محض ذہنی انقلاب، نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالٰے کی رحمت سے امید ہے کہ اگر امت مسلمہ ان رہنما اصولوں پر گامزن ہوگئی تو ہم نہ صرف ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بلکہ ایک مرتبہ پھر افق عالم پر شرف و افتخار کے ساتھ آفتاب درخشاں بنکر نمودار ہونے کی بھی بشارت مل جائے گی۔ ربّ کریم و رحیم سے دُعا ہے کہ وہ ہماری اس حقیر سعی کو قبول فرمائے۔ آمین۔

آخر میں قارئین کرام سے بالخصوص دینی، تعلیمی و سماجی فلاح و بہبود کے اداروں، امن عامہ اور انتظامیہ سے دلچسپی رکھنے والے محبان وطن نیز انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ اصلاح معاشرہ کے ہمارے "روحانی نظریہ" کو مزید مفید و موثر بنانے کے لئے اپنے گرانقدر مشوروں سے ہمیں مستفید فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں ان کو بھی اس رسالہ میں شامل کر دیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ

مؤلف

حبیب الرحمٰن

صدر انجمن سماجی بہبود، ۱۷ر نیو چوبرجی پارک

اے بلاک، لاہور

انسان کی پُروقار حیثیت

اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنی تمام خلائق پر، ایک نہایت پُروقار اور مرکزی کردار کی حیثیت عطا فرمائی ہے۔ یہ اسی کی شان میں تو ارشاد فرمایا:

ہم نے اِس کو خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ (صٓ - ۷۵)

ہم نے انسان کو بہت ہی خوبصورت سانچے (احسنِ تقویم) میں ڈھالا۔ (التین - ۴)

ہم نے اِس کی صورت اور اعضاء نہایت متناسب اور عمدہ بنائے۔ (المومن - ۶۴)

ہم نے اِس کے جسدِ خاکی میں روح پھونک کر زندہ و تابندہ کر دیا۔ (صٓ - ۷۲)

ہم نے اس کے فائدے اور خدمت کیلئے کائنات کی ہر چیز مسخر کردی (الحج ۶۵)

ہم نے اس کی توقیر اور عظمت کی خاطر تمام فرشتوں اور جنات کو سجدے میں گر پڑنے کا حکم دیا۔[1] (البقرہ - ۳۴)

ہم نے اس کے استقبال کے لئے جنت کو آراستہ کیا اور اسکی تکمین ہی کی

---

[1] گویا خود خالق کائنات بھی اپنے اِس حسین شاہکار پر اتنا فریفتہ اور نازاں ہوا کہ اس کو متعارف کرانے کیلئے ایک نئے انداز سے جشنِ تخلیق آدم آراستہ فرمایا۔

خاطر حوّا کو اُن کے ساتھ جنت میں بسایا۔ (الاعراف ۱۹، ۱۸۹)

پھر اس کو زمین پر اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کر کے جلیل القدر منصب پر فائز کیا۔ (البقرہ۔۳۰)

اور بالآخر!

ہم نے اس پر اپنی تمام نعمتیں ہی پوری فرما دیں۔ (المائدہ۔۳)

غور کیجئے کہ انسان پر یہ خدائے بزرگ و برتر کا کتنا احسانِ عظیم ہے۔ اور ہم پر اِن بیش بہا نعمتوں کا کسقدر شکر واجب ہے؟ کیا ہم نے اللہ جل شانہٗ کی ان نعمتوں کی ایسی ہی قدر کی جیسی انکی قدر کرنے کا حق ہے؟ کیا اس کی یہ کریمانہ مہربانیاں اور نوازشیں ہمیں پکار پکار کر دعوتِ غور و فکر نہیں دے رہیں کہ آخر ایسی شان اور قدرت و جبروت کے مالک اور خالق نے نوعِ انسان کو اِسقدر اعزاز و اکرام کیوں بخشا؟ وہ کیا خوبی اور حکمت اِس میں رکھ دی گئی جس سے وہ ساری کائنات میں مکرم بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اس گوہر نایاب کی تخلیق کوئی اتفاق نہیں، کوئی حادثہ نہیں بلکہ یقیناً کوئی عظیم مقصد پیشِ نظر ہوگا۔

نرا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اسکا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

تخلیقِ آدم کی حکمتیں

یہ راز تو اسوقت ہی آشکارا ہوگیا تھا جب خالقِ کائنات نے ایک خلیفہ مقرر کرنے کے ارادے کا تذکرہ اپنے فرشتوں سے فرمایا تھا۔ اس وقت فرشتوں نے جواب میں کہا تھا کہ:

"اے اللہ! کیا تو ایسے کو نائب مقرر کرے گا جو اِس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزیاں کرے گا۔" (البقرہ۔۳۰)

فرشتوں کے اِس اعتراض کا مقصد دراصل طعن نہ تھا، بلکہ حکمت خلافت

دریافت کرنا تھا[1]۔ اِس استفسار سے ملائکہ یہ سمجھ گئے کہ حاکم وخلیفہ کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب ظلم وفساد ہو گا[2]۔ یہ مسلم ہے کہ فرشتے تو اللہ تعالےٰ کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ بہت حمد وتسبیح کرنے والے ہیں۔ اِس لئے آسمان پر تو فساد کا کوئی امکان نہ تھا۔

البتہ پیدائش آدم علیہ السلام سے ساٹھ ہزار سال پہلے جنات کو زمین میں بسایا گیا تھا۔ یہ جنات زمین میں سات ہزار سال تک آباد رہے لیکن پھر آپس میں بغض وعناد شروع ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے آپس میں جنگ وخونریزی کی۔ اس وقت ابلیس جس کا نام عزازیل تھا بہت مقبول بارگاہِ الٰہی تھا۔ اور تمام ملائکہ میں بڑا عالم اور عابد۔ اس کو حکم ہوا کہ اپنے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت لے جائے اور جنات کو زمین سے نکال کر ان کو جزیروں اور پہاڑوں میں آباد کر دے۔ چنانچہ ابلیس نے ایسا ہی کیا[3]۔

اِس اعتبار سے فرشتوں نے آدم کو بھی جنات پر تصور کیا اور وہ اسمیں شاید حق بجانب بھی تھے کہ انسان بھی زمین میں فساد اور خونریزی ہی مچائے گا۔ ابلیس نے بھی آدم کو محض مٹی کا پتلا ہی سمجھا اور اللہ تعالےٰ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا کہ آدم کو زمین میں خلیفہ بنایا جائے۔ بلکہ اپنے آپ کو تمام ملائکہ سے افضل خیال کیا اور تکبر وغرور کر بیٹھا اور راندۂ درگاہِ ایزدی ہوگیا۔

اگرچہ اللہ تعالےٰ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے لیکن مفسرین نے پیغمبروں کے خلیفہ مقرر کرنے کی بہت سی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ بندوں کی حق تعالےٰ تک رسائی نہیں اس لئے ایک ایسے واسطے کی ضرورت پیش آئی

---

[1] حاشیہ قرآن از مولانا نعیم الدین مراد آبادیؒ [2] حاشیہ قرآن از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

[3] اشرف التفاسیر صد ۲۵۱ از مفتی احمد یار خاں بدایونی۔

جو رب کا کلام مخلوق تک پہنچا دے - دوسرے یہ کہ ان کو رب نے علم عطا فرمایا - تیسرے یہ کہ پیغمبر اللہ کی صفات کے مظہر ہیں - چوتھے یہ کہ ان کو ایسی قدرت کاملہ عطا فرمائی گئی جو رب کی قدرت کا نمونہ ہے - پانچویں یہ کہ دنیا کی ہر چیز ان کے قبضے میں دے دی گئی اور چھٹے یہ کہ جسم کے علاوہ، روحانیت میں بھی ان کو بہت تصرف حاصل تھا -

دراصل خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی ملک میں کسی حاکم اعلےٰ کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام کے مطابق نظم و نسق سنبھالے اور عمل کرے، اور وہ فرائض انجام دے جو اس کو تفویض کئے جائیں - اِس جلیل القدر منصب سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے کے لئے اس کے نائب میں ضروری استعداد اور علمیت کا ہونا لازمی ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے بھی انسان کو ضروری استعداد سے سرفراز فرمایا لیکن چونکہ فرشتوں کا علم محدود تھا، اس لئے وہ انسان کے خلیفہ بننے کی حکمتوں کو سمجھنے سے قاصر رہے - مفسرین نے ان حکمتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو یہ ہیں :-

١- اگر فرشتے کامل عابد ہیں تو انسان کو وسیع علم عطا کیا گیا - عابد کے لئے مسجد کا محراب لیکن عالم کے لئے خلافت کا تخت و تاج ہے -

٢- فرشتوں کا تعلق صرف عالم ارواح سے ہے - مگر انسان کا اجسام اور ارواح دونوں سے ہے کیونکہ اسے جسم اور روح دونوں ملی ہیں -

٣- فرشتے اطاعتِ الٰہی پر مجبور ہیں - عبادت ان کی غذا ہے - لیکن انسان کی عبادت اختیاری ہے -

٤- فرشتوں کو عبادت سے روکنے والی کوئی چیز نہیں - انسان کے لئے ہزاروں رکاوٹیں درپیش ہیں - وہ سب پر لات مار کر اللہ تعالےٰ

ف اشرف التفاسیر صد ٢٥٢، ٢٥٣ -

کی اطاعت کو ترجیح دیتا ہے ۔ لہٰذا اس کا ایک سجدہ فرشتوں کے کئی سجدوں سے افضل ہے ۔

۵ ۔ فرشتوں سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا ۔ اِس لئے محض فرشتوں کی موجودگی سے اللہ تعالےٰ کی شانِ ستاری اور غفاری ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ تھا ۔ انسانوں میں گنہگار بھی ہوں گے جن کے گناہوں پر رب رحیم و کریم پردہ ڈالیں گے اور جب وہ اپنے گناہوں سے نادم اور شرمندہ ہو کر توبہ کرینگے تو اللہ تعالےٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم سے اسکی مغفرت فرمائینگے ۔

۶ ۔ فرشتے غصہ اور شہوت سے پاک ہوں گے ۔ لیکن انسان کی یہ خصلتیں اگر اللہ تعالےٰ کی راہ میں صرف ہوں گی تو ان سے بڑے عمدہ نتائج نکلیں گے ۔ اس کے دل میں محبت الٰہی کا جوش اور جذبہ پیدا ہوگا ۔ اور جب وہ اپنا غصہ رضائے الٰہی کے لئے استعمال کرے گا تو میدانِ جہاد میں جانبازی کے جوہر دکھائے گا ۔ اور غازی بنکر لوٹے گا یا شہادت کا مقام حاصل کرے گا ۔

۷ ۔ انسانوں میں جہاں فاسق و فاجر و بدکار ہوں گے ، وہاں ان میں عابد و زاہد متقی و پرہیزگار بھی ہوں گے ۔ اللہ تعالےٰ کے وفادار اور رازدار بھی ہوں گے ۔ اور سب سے ارفع و اعلےٰ یہ کہ ان میں محبوب خدا ، مصطفےٰ مجتبیٰ ، احمد مختار رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی ہوں گے ۔ اور ان کے اصحاب کرامؓ اور اہل بیتؓ اطہار بھی ہوں گے ۔

۸ ۔ فرشتے صرف رکوع و سجدہ جیسی عبادتوں پر ہی اکتفا کریں گے ۔ لیکن انسان بے شمار ایسی عبادتیں بھی کرے گا جو فرشتے نہیں کر سکتے ۔ مثلاً وہ بھوکا رہ کر ، روزہ رکھ کر ، مسافر بنکر اور راہِ خدا میں جہاد کر کے ۔

حافظ قرآن اور قاری بنکر، دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا سلوک کرکے۔ کثرتِ ذکر لسانی اور قلبی کا اہتمام کرکے وغیرہ وغیرہ[1]۔

کیا ہر انسان خلیفہ ہے؟

ان حکمتوں کے پیشِ نظر بعض مفسرین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ سارے انسان ہی خلیفہ ہیں وہ قرآن کریم کی اِس آیت پر استدلال کرتے ہیں:

جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ

لیکن اِس آیت کا صحیح مفہوم ایک دیگر قرآنی آیت سے واضح کر دیا گیا۔ جس میں ارشاد فرمایا کہ:

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں (کہ) اُنکو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔"

(النّور - ۷)

اِس آیت کریمہ سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ انسانوں میں سے صرف انکو خلیفہ بنایا جائے گا جو اللہ تعالےٰ پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کرینگے۔ ظاہر ہے کہ جو انسان ان صفات والے نہیں وہ اس کے خلیفہ بننے کے اہل کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کو خلیفہ بنا دیا جاتا، پھر تو ہر طرف تباہی مچ جاتی۔

"اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے اور تباہ کر دے کھیتوں کو اور نسلِ انسانی کو۔"

(البقرہ - ۲۰۵)

---

[1]: اشرف التفاسیر

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو اللہ تعالےٰ پر ایمان نہ لائیں اور نہ نیک عمل کریں تو پھر بھی اس نافرمانی پر ان سے کوئی باز پرس نہ ہوگی ۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

"تم میں سے ہر شخص راعی ہے ۔ اور ھر راعی خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے ۔"

مقصد حیات

بہرحال انسان کی پیدائش میں مرکزی اور نمایاں حکمت تو یہی تھی کہ زمین میں ظلم اور فساد نہ ہو ۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ابتدا ہی میں یہ تنبیہ فرما دی تھی کہ :

"کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے ۔" (البقرہ - ٦٠)

اور یہ بھی فرما دیا تھا کہ :

"اللہ تعالےٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ۔"

(المائدہ آیت ٦٤)

ایک اور جگہ اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے :

"میں نے انسانوں اور جنّات کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے ۔"

یہاں بھی عبادت سے مراد یہی ہے کہ :

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول

یعنی اللہ تعالےٰ کی اطاعت اِس طرح کی جائے کہ ہر معاملہ میں کتاب و سنت کا کامل اتباع ہو ۔ اِس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انسانوں

کو انفرادی اور اجتماعی طور پر برائیوں سے روکا جائے۔ تاکہ ہر قسم کے ظلم اور فتنہ و فساد کا قلع قمع ہو جائے۔ اور ایک صالح اور برائیوں سے پاک معاشرہ وجود میں آجائے۔ چنانچہ اِس خیال کی تائید اللہ تعالےٰ کے اِس ارشاد سے ہوتی ہے کہ:

"تم بہترین امت ہو جو ظاہر کئے گئے ہو لوگوں کے لئے — تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔" (آلِ عمران — ۱۱۰)

اُمتِ مسلمہ سے پیشتر کی اُمتوں سے بھی یہی توقع رکھی گئی تھی۔ لیکن وہ اِس آزمائش میں پورے نہ اتر سکے اور نامراد ہوئے۔ رب العلمین نے فرمایا۔

"توجو امتیں تم سے پہلے ہوگذریں، ان میں خیر خواہی کرنے والے بھی کیوں نہ ہوئے کہ ملک میں فساد کرنے سے منع کرتے سوائے چند لوگوں کے جنکو ہم نے نجات دی۔" ہود ۱۱۶

ایک اور مقام پر تو اس کی مکمل وضاحت فرمادی کہ:

"اور اگر ان سے لڑو، تو یہاں تک کہ کوئی فساد باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے۔" (الانفال — ۳۹)

ان تمام ارشادات سے ظاہر ہے کہ اِنسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجنے کا ایک اہم ترین مقصد ہر طرح کے ظلم و استحصال کا خاتمہ، فتنہ و فساد کا تدارک اور نیکیوں کا فروغ اور عدل و انصاف کا نفاذ ہے۔ تاکہ پوری انسانیت کو ہر طرح کے غم و اندیشہ سے نجات مل جائے۔ اسی کا نام "صالح معاشرہ" کا قیام ہے۔

پہلی امتوں نے مقصد تخلیق پورا نہ کیا تو ہلاک کر دی گئیں

اللہ تعالےٰ سے زیادہ علیم و خبیر کوئی نہیں - وہی بہتر جانتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے جو حکمتیں وابستہ کی گئی تھیں، اِنسان انھیں کس حد تک پوری کر سکا اور وہ اللہ تعالےٰ کے مقرر کردہ معیار پر کہاں تک پورا اترا - سابقہ امتوں کے احوال کی مکمل تاریخ تو آج دستیاب نہیں - البتہ ان کی کچھ جھلکیاں آسمانی صحیفوں میں ضرور ملتی ہیں، جس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ معیار پر پورے اترنے والے انسانوں کا تناسب برائے نام ہی رہا - ان میں سے اکثر و بیشتر تو ننگ انسانیت ہی ثابت ہوئے - یہ ان ہی امتوں کے بارے میں تو فرمایا گیا -

۱- " کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان کا کیا انجام ہوا (حالانکہ) وہ لوگ اِن سے زیادہ تھے اور قوت اور نشانوں میں، جو کہ زمین پر چھوڑ گئے، بڑھے ہوئے تھے، سو ان کی (یہ تمام تر) کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی "۔ (المؤمن - ۸۲)

۲- " وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے (نہریں) اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات اور آرام کا سامان جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے - اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وارث بنا دیا - نہ تو ان پر آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ ہی انکو مہلت دی گئی "۔ (الدخان ۲۷ تا ۲۹)

۳- " یہ غارت شدہ بستیوں کے حالات تھے جن کو آپ سے بیان

کرتے ہیں۔ تو ان میں کچھ (عبرت کیلئے) قائم ہیں اور (بعض کا) بالکل خاتمہ ہوگیا۔ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔" (ھود - ۱۰۰)

وہ اللہ تعالےٰ کی نافرمانیاں کرکے ظلمت و گمراہی میں اس قدر ڈوب گئے تھے کہ انکی اصلاح و رہنمائی کے لئے سینکڑوں یا ہزاروں ہی نہیں بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر، بے شمار معجزات اور نشانیوں کے ساتھ مبعوث کئے گئے۔ لیکن ان سب پر کیا بیتی!

"اور ہم پہلے لوگوں میں بہت سے نبی بھیجتے رہے اور ان لوگوں کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جسکے ساتھ انھوں نے استہزا نہ کیا ہو۔" (الزخرف - ٦)

چنانچہ ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے مایوس ہو کر یہی پکار اٹھے کہ:

۱- "تب موسیٰؑ نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ بڑے سخت مجرم لوگ ہیں۔" (الدخان ۲۲)

۲- "اے میرے پروردگار! کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ۔ اگر آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دینگے تو آپ کے (نیک) بندوں کو گمراہ ہی کردیں گے۔ اور انکے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی۔" (نوح - ۲٦)

اور پھر ان کا انجام کیا ہوا:

"اور جو قومیں ان سے پہلے ہو گذری ہیں، ہم نے انکو ہلاک کر ڈالا۔ وہ مجرم (یعنی نافرمان تھے)۔" (الدخان - ۳۷)

لیکن غور کیجئے کہ ان انتہائی مایوس کن نتائج کے باوجود اللہ جل شانہٗ اپنی بے پناہ کریمی اور رحیمی کے باعث بنی نوع اِنسان کو مہلت پر مہلت دیتا چلا آرہا ہے۔ وہ یقیناً انسان کی فطری صلاحیتوں اور استعداد سے مایوس نہیں۔ وہ خود ہی تو اس کا معمار ہے۔ اسی نے تو اسے حسین سانچے میں ڈھالا ہے۔

موجودہ انسانوں کے حالات بھی کچھ مختلف نہیں

آیئے دیکھیں کہ موجودہ دور کے انسانوں نے اِس مہلت سے کہاں تک فائدہ اٹھایا۔ سابقہ امتوں کے واقعات سے کیا عبرت پکڑی اور ظلم و فساد کے مٹانے اور امن عالم کے قیام میں وہ کس حد تک کامیاب رہا۔

صورتحال یہ ہے کہ آج جس طرف نگاہ اٹھایئے ایک رُوح فرسا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایٹم بموں اور راکٹوں کا دور ہے۔ خلائی پروازوں کا دَور ہے۔ چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈالی جارہی ہیں لیکن ساتھ ہی ہلاکت خیز ہتھیاروں کی یورش بھی ہے جس کے خوف نے انسانیت کی بقا ہی کو غیر یقینی اور غیر محفوظ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہر طرف موت اور تباہی کے تاریک سائے منڈلا رہے ہیں۔ خشکی پر ہی نہیں سمندروں میں بھی ایٹمی اسلحہ سے لیس جنگی جہازوں کے بیڑے آگ اگلنے کو تیار کھڑے ہیں۔ سفید فام لوگوں نے سیاہ فام لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ نسل پرستی کے بھیڑیئے اس مہذب زمانہ میں بھی انسانوں کی چیر پھاڑ کے لئے چھلانگیں لگاتے ہوئے غاروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور ایشیائی اور افریقی قوموں پر انکی گرفت کا یہ عالم ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ سائنسی اور تکنیکی مہارت کے بَل بوتے پر انسانوں پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھ بیٹھے ہیں۔ غرضیکہ ہر ملک اور ہر قوم کے افراد اعصابی کھنچاؤ اور تناؤ اور ذہنی انتشار سے دوچار ہیں۔

قیام امن عالم کا لبادہ اوڑھ کر فساد کی آگ اور بھڑکا رہے ہیں اور اس طرح کمزور قوموں پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔

معاشرتی بدحالی

معاشرتی بدحالی بھی عروج پر ہے ۔ اس کا کچھ اندازہ تو اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اخبارات میں شائع ہونے والی تقریباً نصف خبریں مختلف جرائم کے ارتکاب کے متعلق ہوتی ہیں ۔ جن میں قتل، ڈاکے، چوری، فحاشی بدچلنی، فریب دہی، ملاوٹ، سمگلنگ جیسے اخلاق سوز اور سنگین جرائم شامل ہیں ۔ سالہا سال سے ہر ملک میں انتظامیہ اور اصلاحی ادارے نظم و نسق کی دیکھ بھال پر مامور ہیں ۔ لیکن اس کثیر خرچ کے باوجود جرائم سے پاک اور صالح معاشرہ کا خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔ جس میں انسان کسی خوف اور اندیشہ کے بغیر سکون و اطمینان کا سانس لے سکیں اور ان کو ایک پر امن ماحول میں شریفانہ زندگی بسر کرنے کی ضمانت مل جائے ۔

اگر ہم اپنے ہی ملک کے اعداد و شمار پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ آج سے دس سال پیشتر مغربی پاکستان میں عام جرائم کی اوسط سالانہ شرح تقریباً دو لاکھ تھی ۔ مگر اب یہ شرح ایک محتاط اندازے کے مطابق دوگنے سے بھی تجاوز کر گئی ہے ۔ مغربی پاکستان میں ہر سال کم و بیش پانچ ہزار انسان قتل کر دیئے جاتے ہیں، جن میں سے ایک تہائی ناجائز تعلقات کی وجہ سے قتل ہوتے ہیں ۔ اسی طرح چار پانچ ہزار عورتیں جن میں کم سن لڑکیاں اور لڑکے شامل ہیں، بدچلنی کی خاطر اغوا کر لی جاتی ہیں ۔ جعلسازی ۔ دغا فریب اور خیانت مجرمانہ کے واقعات بھی چار ہزار سالانہ سے کم نہیں ۔ ہر سال تقریباً پانچ لاکھ

اشخاص مختلف فوجداری جرائم کے مرتکب پائے جا کر چالان عدالت کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے تقریباً دو تین لاکھ عدالتوں سے سزایاب ہو جاتے ہیں اس طرح جرائم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ "سزا یافتہ اشخاص کی شرح بھی ہمارے معاشرہ میں تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق (مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۷۵ء) پنجاب میں قتل کی وارداتوں میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کی مدت میں ۴۳ فیصد اضافہ ہوا۔ لاہور، ساہیوال، فیصل آباد اور ملتان جیسے بڑے شہروں میں یہ وارداتیں سب سے زیادہ ہوئیں۔ صرف لاہور کے علاقہ میں چوری کی وارداتوں کی اوسط شرح ڈیڑھ دو ہزار ماہوار ہے۔ جب کہ عام جرائم کی ماہوار شرح سات آٹھ ہزار سے کم نہیں۔ اور اب تو مجرمان کی سرکشی شہروں میں اِس حد تک بڑھ چکی ہے کہ اوباش اور بے لگام غنڈوں کی دسترس سے ہمارے بنک، پٹرول پمپ، ٹرانسپورٹ اور تجارتی مراکز بھی محفوظ نہیں رہے۔ حتیٰ کہ چلتی بسوں اور ویگنوں کو شاہراہوں پر روک کر مسافروں کو جبراً لوٹ لیا جاتا ہے۔ یہ سب اخلاقی پامالی کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟

مغربی تہذیب و تمدن کا ایک عبرتناک واقعہ

یہ معاشرتی انحطاط صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں، بلکہ مغربی تہذیب سے متاثر ہر ملک میں ایسے ہی حالات درپیش ہیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں تو حالات نہایت تشویشناک ہیں۔ صرف ایک ہی واقعہ نے مغربی تہذیب کی ترقی کے بلند بانگ دعوے کی قلعی کھول کر دکھدی۔ دنیا کے خوشحال ترین شہر نیویارک میں مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۷۷ء کو آسمانی بجلی گرنے سے پاور اسٹیشن

تباہ ہو گیا اور تقریباً پچیس گھنٹے تک سارا شہر اندھیرے میں ڈوبا رہا۔ اِس اچانک تاریکی کے دوران دہشت گردی اور دلوں میں چھپا ہوا جرائم کا رجحان لاوا بنکر پھٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر ہولناک جرائم کی لپیٹ میں آگیا۔ جن میں بوڑھے، بچے، جوان، عورتیں اور لڑکیاں سب شامل تھے۔ ملبوسات، ٹی وی سیٹ، زیورات، اور شراب کی دکانیں سب سے پہلے نشانہ بنیں۔ بعدازاں غذائی اشیاء، فرنیچر اور ادویات کے سٹور لوٹے گئے۔ تجارتی مراکز کے شٹر اور شیشے توڑ کر سامان نکال لیا گیا۔ ایک ہزار مقامات پر آگ لگا دی گئی۔ ایک ہی شوروم سے پچاس نئی موٹر کاریں (مالیتی ڈھائی لاکھ ڈالر) چوری کرلی گئیں۔ ایک فرنیچر کے مرکز سے ۵۵۰۰۰ ڈالر کا قیمتی سامان لے اڑے، کم از کم دو ہزار سٹور مکمل طور پر لوٹ لئے گئے۔ پانچسو اشخاص زخمی ہوئے۔ تقریباً چار ہزار افراد گرفتار کئے گئے اور سب نئی پرانی جیلیں بھر گئیں۔ بعض مقامات پر لیٹروں نے آپس ہی میں لوٹ مار شروع کر دی۔ تقریباً آٹھ ہزار پولیس کی نفری ڈیوٹی پر طلب کیگئی۔ لیکن پھر بھی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ لوٹا ہوا سامان سڑکوں پر رکھ کر کوڑیوں کے مول فروخت کر دیا گیا۔ لیکن ضرورتمندوں کو بے اندازہ لوٹا گیا۔ سب سے زیادہ شرمناک پہلو یہ تھا کہ جو عورتیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے میں ناکام رہیں، نہ صرف یہ کہ انکی بے حرمتی کی گئی بلکہ جبراً عصمت دری سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

نیو یارک کے مشہور میگزین "ٹائم" نے اس لوٹ مار کی تفصیل مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں زیرِ عنوان "خوفناک رات" کئی صفحات پر شائع کی اور نقصان کا اندازہ ایک کھرب ڈالر لگایا۔ صرف آگ بجھانے والے اور پولیس کے عملے کو اوور ٹائم کی مد میں   حکومت کو چالیس لاکھ ڈالر کا

نقصان برداشت کرنا پڑا

حادثہ کے اسباب

اِس حادثہ کے اسباب پر اس میگزین نے مختلف لوگوں کی رائے بھی شائع کی۔ اکثر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بے روزگاری، غربت، لاقانونیت کا رجحان اور عدالتوں کا ملزمان کو سزائیں دینے میں نرم رویہ، اس حادثہ کا سبب بنا۔ لیکن ایسا کہنا سچائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ کیونکہ نیویارک یونیورسٹی کے ایک ماہر نفسیات مارٹن بارڈ نے بالآخر تسلیم کر لیا کہ واقعات کے تجزیہ سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صرف مال و دولت سے محروم افراد ہی اس حادثہ میں ملوث تھے۔ بلکہ وہ لکھتا ہے کہ ان کی حرکات میں پاگل پن نمایاں طور پر جھلکتا تھا۔ پھر اصل محرک کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا:

PEOPLE RESORT TO SAVAGE BEHAVIOR WHEN BRAKES OF CIVILISATION FAIL.

یعنی جب تہذیب و تمدن ناکام ہو جائے تو اِنسان وحشیانہ حرکتوں پر اُتر آتا ہے۔

اِسی طرح نیویارک کے ایک اور مشہور میگزین "نیوز ویک" نے اپنی ۲۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں اس حادثہ کو "ایک خوفناک خواب" اور "دہشت انگیزی کی دنیا" قرار دیا اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ "اگر پھر کوئی ایسا موقعہ ہاتھ آیا تو یہ لوگ دوبارہ ان ہی حرکتوں کا اعادہ کر کے اِس شہر کو جہنم بنانے سے باز نہیں آئیں گے"۔ بالفاظ دیگر بد اخلاقی اب ان کی سرشت بن چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان اخلاقی مجرم بن جائے تو کوئی سوسائٹی ان کا بوجھ اٹھانے کی متحمل

نہیں رہتی۔

نئی نسل میں ذہنی انتشار

اس ایک مثالی واقعہ سے مغربی تہذیب کی سحر کاری کا سارا تار و پود بکھر گیا۔ اب ہمارے ذہنوں میں خصوصاً نئی نسل میں کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیئے۔ جو مغربی دنیا کے مختلف مادی اور معاشی جدید فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے مذہبی اور روحانی معاشرہ سے باغی ہو کر اس کی افادیت ہی سے انکار کر بیٹھے ہیں۔ اور اب تشکیلِ حیات کے لئے ایک اور انقلابی تحریک کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ وہ یہ رویہ اختیار کرنے میں کس حد تک حق بجانب بھی ہیں۔ وہ آزادی کی گود میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ اس لئے خوشحالی اور آسودگی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ لیکن زمانہ کی تلخیوں نے ان کو ہیجان سے دوچار کر دیا ہے۔ ان کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے وسائل و ذرائع میسر نہیں، اگر کہیں میسر بھی ہیں تو ان تک ان کی رسائی نہیں۔ وہ اپنی تہی دامنی سے تنگ آچکے ہیں اور سماجی ناانصافیوں اور اقتصادی ناہمواریوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دورِ جدید کے سائنسی اور تکنیکی کارنامے ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ایٹمی دور کی ہلاکت خیزیوں نے ان کے مستقبل کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ بے چینی، ہیجان اور اضطراب عام ہے۔ لہٰذا ایک بہتر زندگی، سکون اور آسودگی کی تلاش ایک فطری تقاضا ہے۔ اندریں حالات اگر ہم نے حقیقت پسندی سے کام نہ لیا اور ان کے اس رویہ پر جھنجھلاہٹ اور نفرت سے جواب دیا تو کسی مفید نتیجہ کے نکلنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں ضرور کوئی ایسا حل تلاش کرنا ہوگا جو نئی نسل کی تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک

یادگار، پرسکون اور پاکیزہ زندگی گذارنے کی انکی امنگوں کو یقینی بنا دے۔ ورنہ ان کا بے پناہ جذبۂ تعمیر و تخلیق سرد پڑ جائے گا۔ ان کی زندگی کا حسین خواب ٹوٹ جائے گا۔ وہ اللہ تعالےٰ اور اس کے عطا کردہ نظامِ حیات کی افادیت سے برگشتہ ہی رہیں گے۔ پھر وہ اپنے خالق اور مالک کے بندے کیسے بن سکیں گے؟

اِس میں شک نہیں کہ نئی پود اب لینن اور ماوزے تنگ کے فلسفوں اور مغربی مفکرین کے حوالے دینے کی اہل ہوگئی ہے۔ اور معاشیات اور سائنس پر طویل بحثیں بھی کر سکتی ہے۔ لیکن ان تمام سائنسی ترقیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کا حاصل کیا؟۔ مغربی تہذیب و تمدن کی تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو کیا راحت اور ذہنی سکون پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ تعلیم و تربیت کا اثر، خصوصاً انسانی اخلاق اور معاشرت پر کچھ پسندیدہ ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ جدید تعلیمی ماحول سے ان کی اُلٹی تخریب کاری ہوئی۔ یہ ہمارا خیال بے بنیاد نہیں۔ امریکہ جیسے جدید اور مہذب ترین ملک کے متعلق اُردو روزنامہ "نوائے وقت" (۱۳ر جولائی ۱۹۷۶ء) میں گذشتہ تعلیمی سال کے دوران، مختلف تعلیمی اداروں میں سرزد ہونے والے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے، انھیں پڑھ کر تو ہماری گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ اِس رپورٹ میں کہا گیا ہے:

"طلبہ نے بارہ ہزار مسلح ڈاکے ڈالے، تقریباً ایک ہزار قتل کئے اس کے علاوہ نو (۹) ہزار عصمت دری کے واقعات اور ستائیس ۲۷ ہزار نقب زنی کی وارداتوں کے مرتکب ہوئے۔"

یہ اعداد و شمار امریکہ کی قومی تعلیمی ایسوسی ایشن نے جاری کئے تھے، عیاں ہے کہ جس تہذیب کے اثرات کا تعلیمی اداروں کے اندر یہ حال ہو تو اُن کی بدانمائیوں اور مجرمانہ رجحان سے معاشرہ ہولناک مصائب کی زد

میں آنے سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے ؟ نیویارک جیسے شہر میں جولائی ۱۹۷۷ء کا واقعہ کوئی اتفاقیہ حادثہ نہ تھا۔ بلکہ یہ دورِ جدید کی مادی اور اخلاق سے عاری تہذیب کا منطقی نتیجہ تھا۔ پاکستان کا ایک اردو رسالہ " اخبارِ جہاں " (۲ اگست ۱۹۷۷ء) میں ایک مضمون نگار اِس واقعہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوتے لکھتا ہے۔

" جو مغربی معاشرہ عورت کی آزادی، اس کے یکساں حقوق اور نسوانی وقار کے بلند و بانگ دعوے کرتا ہے، وہ ایک رات کی اچانک تاریکی میں بھی عورت کو اِس حد تک معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوا کہ اس سے اس کا جوہرِ عصمت زبردستی چھین لینے سے باز رہے۔ یا بُرے وقت میں اس کا محافظ اور ہمدرد بننے کو ترجیح دے "۔

وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ :

" یہ بات کسی طرح قابلِ فہم نہیں کہ بظاہر زندگی کی تمام آسائشوں میں رہنے والے افراد ایک ایسی سوسائٹی کی ترجمانی کریں جو شاید جیل کی سلاخوں کے پیچھے عادی اور اخلاقی مجرموں ہی میں مل سکتی ہے "۔

اِنسانی مسائل حل کرنے میں مغرب کی ناکامی

لہٰذا یہ بالکل واضح ہے کہ اگر ہماری فکر و نظر ہی درست اور صالح نہ ہو تو اخلاقِ حسنہ سے عاری ایسا معاشرہ ضرور جنم لے کر رہے گا۔ جس سے تہذیب کا سارا نظام ہی درہم برہم اور علم و حکمت کا شیرازہ بکھر سکتا ہے۔ مغربی اقوام ایٹمی توانائی اور سائنسی راز معلوم کرنے میں کامیابی پر تو فخر کر سکتی ہیں لیکن انسان کے اندرونی محرکات کا راز، جن کے سبب وہ برائیوں کیطرف راغب ہوتا ہے، معلوم کرنے میں ناکام ہی رہیں۔ اور بالآخر برطانیہ کے

مشہور پروفیسر آرنلڈ تو این بی کو یہ حقیقت تسلیم کرنا ہی پڑی کہ :

" انسان علم تیکنیک کا تو دیوتا بن گیا لیکن زندگی کے مسائل سے نمٹنے میں ابھی تک بن مانس کے ارتقائی مرحلے سے آگے نہیں بڑھ سکا "

مختلف نظریات قائم ہوئے اور رد کر دیئے گئے

چنانچہ برائیوں سے پاک معاشرہ وجود میں لانے کے لئے جو طریقے وقتاً فوقتاً اختیار کئے جاتے رہے، وہ ناکافی ہی نہیں بلکہ اِس مقصد کے حصول میں خود بڑی رکاوٹ بن گئے ہیں - ماہرین نے جرائم کے محرکات کے تجزیہ کی کوشش میں عجیب وغریب نظریات قائم کئے - مثلاً

۱- زمانۂ قدیم میں یہ خیال عام تھا کہ نیکی اور بدی کی طاقتوں کا تصادم ایک مافوق الفطری تقاضا ہے جس سے مفر ہی نہیں - لیکن آج یہ نظریہ کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے - اگر عوام میں ایسا نظریہ رواج پا جائے تو برائیوں کے انسداد کی ساری کوششیں بے سود سمجھی جائیں گی - اور پھر کسی مجرم کو اس کی بدعملی کی سزا دینے کا کوئی اخلاقی جواز باقی نہ رہے گا - اور اِس طرح ہر شخص کو اس تصور کی آڑ میں بداعمالیوں کے لئے کھلی چھٹی مل جائے گی -

۲- اِسی طرح اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ بعض انسانوں کی کھوپڑی کی ایسی مخصوص ساخت ہوتی ہے، جس سے اس کی ذہنی نشوونما میں کمی وبیشی ہوجاتی ہے - جس سے وہ مخصوص قسم کے جرائم یعنے قتل، چوری یا اخلاقی بدچلنی کا مرتکب ہوجاتا ہے - سائنس والوں نے اس تصور کو جرائم کا بنیادی سبب قرار دے دیا - لیکن انیسویں صدی کے وسط میں لوگوں کا اعتماد اس نظریہ پر کم ہوگیا -

۳۔ فرانس کے کچھ ماہرین معاشرتی ماحول کے نظریہ پر متفق ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جرائم ایک مخصوص سوسائٹی اور معاشرتی ماحول کی پیداوار ہے۔ یعنی جس طرح لوگ کسی فن یا پیشہ میں مہارت حاصل کرتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو بچپن ہی میں جرائم کا فن سکھایا جاتا ہے۔ گویا انھوں نے پیشہ ور مجرمان کا نظریہ تسلیم کیا۔

۴۔ فرانس کے ایک ماہر عمرانیات نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوسائٹی میں بڑے شہروں میں جو جرم سرزد ہوتے ہیں، انھیں دیہات والے نقل کر لیتے ہیں۔ اور اعلےٰ سوسائٹیوں میں جو جرم کسی وقت کئے جاتے ہیں، وہی دوسرے لوگوں میں بھی عام ہو ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ نظریہ تسلیم کیا گیا کہ معاشرتی نظام ہی سے جرم کی ابتدا ہوتی ہے لیکن اس نظریہ کو کم ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ شاید اِس لئے کہ یہ تصور ایسا ہی ہے جیسے تانگہ کو گھوڑے سے آگے جوتنا۔

۵۔ ایک ڈچ ماہر جرائم نے سرمایہ دارانہ نظام کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ یعنی دولت کی زیادتی نے عیش و عشرت میں پھنسا دیا اور غربت کے مارے ضروریاتِ زندگی اور جبلی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے چوری اور جنسی جرائم میں مبتلا ہو گئے۔

۶۔ ایک اطالوی حکیم نے انیسویں صدی کے آخر میں یہ نظریہ قائم کیا کہ مجرم اصلاً پیدائشی ہوتا ہے اور جسمانی اور دماغی بناوٹ کی خرابی اس کی پیداوار ہے۔ قاتلوں کے متعلق کہا کہ وہ لاعلاج ہیں ان کو ضرور پھانسی لگائی جائے اور تشدد والے مجرمان کی سخت نگہداشت کی جائے۔ اور چوری کرنے والے کو محنت اور مزدوری کرنے پر مجبور کیا جائے۔ تا کہ روزی حاصل کریں۔ ایک مفکر نے تو یہاں تک کہدیا کہ ہر عدالت میں ایک ایسا ماہر رکھا جائے جو مجرم کے عادی ہونے یا پیدائشی ہونے کا اندازہ لگا کر سزا کی مقدار مقرر کرے۔

لیکن ایک انگریز نے ثابت کیا کہ خدوخال کا اِس میں کوئی دخل نہیں ۔ بلکہ جسمانی ساخت تو وراثت میں نسلاً بعد نسلاً ملتی ہے ۔ چنانچہ یہ نظریہ رد کر دیا گیا ۔

۷ ۔ بعض ماہرین نے نفسیاتی نظریہ پیش کیا یعنی جو کم ہمت ، بزدل یا جذباتی ہو یا جلد گھبرانے والا ہو یا غفلت اور لا پرواہی سے سوسائٹی کے اصولوں سے انحراف کرنے والا ہو ۔ یا اچھائی یا برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت کم رکھتا ہو ۔ وہ جرائم میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا ایسے شخص کو ذہنی کشمکش سے نجات دلائی جائے ۔ چند امریکی ماہرین نے بھی اِس تصور کی تائید کی کہ کم ہمت اور بزدل اشخاص ہی جرائم کیطرف زیادہ راغب ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا جسمانی اور دماغی خدوخال کے نظریہ کے مقابلہ میں نفسیاتی اور جذباتی اسباب کی طرف زیادہ توجہ دی جانی چاہیئے ۔

۸ ۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں ایک امریکن ڈاکٹر کی یہ رائے تھی کہ تمام مجرم ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے ۔ بلکہ ہر انسان کے ساتھ جرم کرنیکی مختلف وجوہات ہوتی ہیں ۔ مثلاً اندرونی کشمکش کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ۔ ناخوشگوار حالات سے بچنے کے لئے ۔ خواہشات نفسانی پورا نہ ہونے پر مایوسی اور اضطراب کے باعث ۔ خود پسندی کے جذبہ کے تحت ۔ معاشرہ میں بہتر مقام منوانے کے لئے ۔ سوسائٹی سے انتقام لینے کیلئے جس کے باعث وہ پریشان حال زندگی گذارنے پر مجبور ہوا ، وغیرہ ۔

۹ ۔ چنانچہ کچھ ماہرین نے اِس خیال سے اتفاق کیا کہ نفسیاتی اور معاشرتی دونوں کے باہمی اثرات سے مجرمانہ رجحان پیدا ہوتا ہے ۔ ان کے خیال میں اس قسم کی مجرمانہ ذہنیت بچپن ہی سے شروع ہو جاتی ہے ۔ ایک

مرتبہ بے راہ روی کی عادت پڑ جائے تو پھر انسداد کا کوئی یقینی اور مؤثر ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ پھر اپنی نفسانی خواہشات اور جبلتی ضرورتوں کو ہر قیمت پر پوری کرنا چاہتا ہے۔

۱۰۔ دور جدید کے سائنس دانوں اور فلسفیوں کا خیال ان سب سے جدا ہے۔ ان کے خیال میں اس رجحان کے بے شمار محرکات ہیں مثلاً غربت، بے روزگاری، مایوسی کثرت آبادی۔ صنعتی ترقی، شہری زندگی، نامناسب ماحول ہمسائیگی، والدین کی ناچاقی، تعلیم کی کمی، شراب نوشی، منشیات کا استعمال وغیرہ۔ اخبارات، ریڈیو ٹیلی ویژن۔ سینما، فحش ادب اور تصاویر کو بھی کافی حد تک اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ لیکن کچھ ایسے ماہرین بھی ہیں جنھوں نے خواہشات نفسانی کی تکمیل کو فطری تقاضا قرار دے کر اپنی شکست کا گویا اعتراف ہی کر لیا۔ اس کا کچھ اندازہ ایک تازہ ترین رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے کہ نیوزی لینڈ جیسا چھوٹا مگر مغربی تعلیم و تہذیب کا علم بردار ملک بھی اس فلسفے کے مخرب اخلاق اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ گذشتہ سال ۱۹۷۸ء میں اس ملک میں پچاس ہزار بچے پیدا ہوتے۔ جن میں دس ہزار سے زائد ناجائز تعلقات کا شاخسانہ تھے۔ (نوائے وقت ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء)

بہرحال ان تمام نظریات کے باوجود مغربی دانشوروں کو اس میدان میں اب تک کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس اب تو صورتحال یہ ہے کہ برائیوں نے ایک عالمگیر وبائی مرض کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ناکامی کے اسباب

درحقیقت اصل مرض کی تشخیص کے بغیر صرف جسم کے ظاہری حصوں پر نمودار

ہونے والی تکالیف کے علاج سے مریض کلی طور پر شفایاب نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ میں پیدا ہونے والی برائیاں اور غلاظتیں مرض کی محض ظاہری علامتیں ہیں۔ اصل اسباب کو جو ان خرابیوں کو جنم دیتے ہیں، نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ محرکات جرائم پر تو طویل بحثیں چھیڑی گئیں لیکن انسان کے فکر و نظر پر پاکیزہ خیالی اور تزکیۂ نفس کے محکم اور سنگین پہرے بٹھانے کا خیال تک نہیں آیا۔ خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کو فطری تقاضا قرار تو دے دیا مگر انسانی طلب کے زاویہ درست کرنے کی تعلیم کو کوئی اہمیت نہ دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اندازِ فکر کی افادیت سے دانستہ آنکھیں چرائی گئیں ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنا خود اُن کی بدعادتوں کی تکمیل میں سدِ راہ ثابت ہوتا۔ اور پھر انھیں اپنی بے جا خواہشات اور غیر ضروری آرزوؤں کی بساط کو ہمیشہ کیلئے لپیٹنا پڑ جاتا۔ ایسی خواہشات اور آرزوؤں کی ناکامیوں سے تو مایوسی، ذہنی انتشار اور کشمکش کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ حالانکہ ضرورت اِس بات کی تھی کہ انسان دل برداشتہ ہوتے ہوئے بھی انتشار کا شکار نہ ہو۔ اخلاقیات کا سبق اسی لئے لازمی ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا محض اخلاقیات کے سبق پڑھا دینے سے کام چل سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ جب تک بعض بنیادی اصولوں پر کامل یقین نہ ہو بہتر اخلاق کا کوئی موثر محرک نہیں بن سکتا۔

آج ہر طرف ایک طلاطم برپا ہے۔ اِنسان انسان کو کھا رہا ہے۔ کہیں رنگ و نسل کے جھگڑے ہیں۔ کوئی تاج و تخت کے لئے نبرد آزما ہے۔ ایک طرف عالی شان منزل در منزل فلک بوس عمارتیں ہیں، تو دوسری طرف لوگ نانِ شبینہ کیلئے بھی محتاج ہیں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ آخر یہ ساری ہنگامہ آرائی کس لئے ہے؟ یہ انسانیت کا تار و پود کیوں بکھیرا جا رہا ہے۔ اِس سے تو یہی نشاندہی ہوتی ہے کہ ضرور کوئی ایسی بنیادی لغزش ہوئی ہے۔ جس کی سزا اِس

وسیع پیمانے پر مخلوق کو دی جا رہی ہے ۔ دراصل اس تمام خرابی کا آغاز وہ مغربی فکر و نظر اختیار کرنا ہے ۔ جس میں دین اور دینی تعلیم کو کوئی مقام حاصل نہ تھا ۔ مغربی مفکرین کی تمام تر توجہ کا مرکز دنیوی خوشحالی اور جسمانی تسکین ہے ۔ روحانی تطہیر و تسکین اور آخرت کی زندگی کا اس میں کوئی اہتمام نہیں تھا ۔ جس کا تعلیم یافتہ طبقہ پر لازمی تاثر یہ ہوا کہ صرف مغربی علوم و فنون ہی کامیاب زندگی کے واحد ضامن ہیں وہ دنیوی کامیابی کو اپنے فکر و عمل کی صداقت کی دلیل سمجھ بیٹھے ہیں ۔ اور دور جدید کے سرعت سے بدلتے ہوئے ایٹمی معاشرہ میں، اسلامی فکر و شعور کو غیر متمدن، فرسودہ اور ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا ہے چنانچہ مرنے کے بعد کی ابدی زندگی، قیامت اور جزاو سزا کی باتیں کرنے والوں کو قدامت پسند، غیر حقیقی اور خیالی دنیا میں کھوئے انسان کہکر حقارت سے نظر انداز کر دیا گیا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ طعنہ کوئی نئی بات نہیں ۔ جس طرح آج سائنس دان اور نام نہاد روشن خیال لوگ اسلامی نظام حیات کو قابل عمل ہونے پر شبہ ظاہر کرتے ہیں اس طرح چودہ سو سال پہلے کفار مکہ نے بھی ایسے ہی شک کا اظہار کیا تھا ۔ سورۃ ابراہیم میں ہے :

" اور کہنے لگے ہم تو جو آپ دے کر بھیجے گئے ہیں اس کو نہیں مانتے اور جس دین کیطرف آپ ہم کو بلاتے ہیں اس میں ہم کو ایسا شک ہے کہ جس سے دل جمتا ہی نہیں ۔" (ابراہیم ۔ ۹)

لیکن دنیا نے دیکھا کہ بنیادی اصولوں سے بغاوت کرنے کا انجام کیا ہوا ۔

" ان سے اگلوں نے جھٹلایا تو انھیں عذاب آیا جہاں سے انھیں خبر

بھی نہ تھی اور اللہ نے انھیں دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور بیشک آخرت کا عذاب سب سے بڑا۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ جانتے۔ (قرآن)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

ہم نے کافروں سے پہلے کتنی قومیں تباہ کر دیں، جو بل بوتے میں اُن سے بڑھ کر تھیں (ہمارا عذاب اترتے وقت) وہ لوگ شہروں کو چھانتے پھرے (موت سے بھاگتے پھرے) کہیں انکو پناہ نہ ملی (قرآن)

دسمبر ۱۹۷۱ء کی ہند و پاکستان جنگ کے دوران ہم خود بھی کچھ ایسے ہی عذاب کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ آج یہ باہمی اختلاف و انتشار بھی عذاب الٰہی کی ہی ایک صورت ہے۔ لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

"(اے نبیؐ) آپ فرما دیجئے کہ وہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا تمھارے مختلف فرقے کر دے اور تم میں بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔" (الانعام: ۶۵)

سورۃ النجم میں فرمایا:

"تو جو کوئی ہماری یاد سے منہ موڑے (قرآن و آخرت کا خیال نہ کرے) اور صرف دنیا کی زندگی سے غرض رکھے تو اس کی طرف سے آپ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) بھی منہ پھیر لیں۔ انکی عقل یہیں تک پہنچی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ "مولوی" سے بدظن کر دیا۔ اچھے ذہین نوجوان انگریزی تعلیم کی طرف چلے گئے اور لنگڑے اور اندھے مسجدوں کے امام بن گئے۔ چنانچہ اِن نااہل لوگوں نے مذہب کا خاکہ کچھ اِس طرح اُڑایا کہ اس کا دائرہ تنگ نظر آنے لگا۔ جس کے باعث ان میں اخلاق و روحانیت کا ذوق ہی پیدا نہ ہو سکا اور ان اوصاف کی افادیت پر سے بھی ان کا یقین اُٹھ

گیا۔ مغربی مفکرین نے دین اسلام کی تفسیر بھی مغربی فکر و نظر کی روشنی میں کی حالانکہ سابقہ امتوں کی آسمانی کتابوں میں مفاد پرستوں نے اس طرح تحریف کر دی تھی کہ ان کی اصل روح ہی مسخ ہو گئی۔ اور ان کا مذہبی اندازِ فکر غیر فطری بن گیا۔ لہٰذا مغرب کو اپنے غیر فطری مذہب سے علیحدگی اختیار کرنے میں ہی اپنی آفیت نظر آئی۔ اور تسخیر کائنات کی طرف چل پڑے۔ لیکن نفوس انسانی کی تربیت سے غفلت برتی تو اخلاقی پستی اقوام مغرب کا مقدر بن گئی۔

انھوں نے تسخیر کائنات ہی کو قابل تسخیر سمجھا، فضائل انسانی کو حاصل نہ کیا اور نہ قائل ہی ہوئے۔ مغرب نے ذکر کے بدلے فکر اختیار کیا۔ فحاشی راہ پا گئی۔ اور زندگی حیوانی سطح پر آ گئی۔ مشرق نے فکر چھوڑا تو غیروں کے دست نگر ہو گئے۔ اقوام مغرب اسلامی ممالک میں پھوٹ ڈال کر نامساعد حالات پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ان سازشوں کا احساس تک نہیں۔ یہ اسی مادہ پرستی کا نتیجہ ہے کہ طبقاتی جنگ دھاندلی، ظلم، ناانصافی، خود غرضی، بدامنی اور بزدلی عام ہے۔ انفرادی آزادی اور انفرادی ملکیت ختم ہو گئی۔ معاشی غلامی، اخلاقی خرابی، اور لوٹ کھسوٹ معمول بن گیا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا تصور ختم ہو گیا۔ نہ دنیا ہی ملی اور نہ آخرت۔

البتہ کچھ عرصہ سے اقوام عالم رحم و عدل، مساوات اور انسانیت کو عالمگیر بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور انسانی حقوق کی آواز بلند کر رہے ہیں۔ لیکن اس کی کامیابی کا کوئی یقین نہیں کیونکہ انسان چاہے کتنے ہی اچھے اخلاقی اصول مرتب کرے وہ محض نظریاتی حد تک محدود رہیں گے کیونکہ ان کے پیچھے کوئی قوت نافذہ یا اتھارٹی نہیں۔ انسانی قانون میں یہ تصور ممکن ہی نہیں کہ جس نے قانون دیا ہے وہ اس کی نافرمانی یا اطاعت کو ہر وقت اور ہر لمحہ دیکھ بھی رہا ہے۔ اور نہ ہی یہ عقیدہ اس میں کارفرما ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں اگر اس دنیوی

قانون سے بچنے میں کامیاب ہو گیا تو مرنے کے بعد کی زندگی میں اِس گناہ سے نہیں بچ سکتا اور یہ کہ نافرمانی کی سزا اُسے ضرور بھگتنا پڑے گی۔ یہ بات صرف روحانی اندازِ فکر ہی سے حاصل ہو سکتی ہے

دسمبر ۱۹۶۳ء میں امریکہ کے محکمہ انصاف کے شعبۂ تحقیق نے امریکن قوم کے نام ایک پیغام میں کہا تھا کہ کیا ہم امریکی باشندے شائستگی اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ اخلاقی پستی ہمارے ملک کے کسی خاص طبقے یا علاقے میں محدود نہیں بلکہ یہ وبا عالمگیر صورت اختیار کر چکی ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس کا دامن داغدار نہ ہو، اس کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل ہمارے اندر اس جرأت کا فقدان ہے کہ ہم لوگوں میں مال و دولت کے حصول کی دوڑ اور معاشرہ میں بلند مقام حاصل کرنے کے جنون کو روک سکیں۔ اِس سے پتہ چلا کہ محض مادی طریقے سے مرض کا علاج ممکن نہیں"

اِسی سال ۱۹۶۳ء میں بین الاقوامی پولیس کے ادارے کے مشیر پروفیسر ڈاکٹر ریلینڈ گراسو برجر، جو فرانس کی دائنا یونیورسٹی کے ریکٹر بھی ہیں، نے تسلیم کیا کہ جب تک یہ شعور بیدار نہ ہو کہ اِس وسیع و عریض کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے اور انسان کا خدا کے ساتھ تعلق کیا ہے، اس وقت تک جرائم کے سدِباب کا کوئی موثر حل تلاش کرنا ممکن نہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پروفیسر نے اس مسئلہ کی اصل نوعیت معلوم کرنے کی طرف صحیح قدم اٹھایا ہے۔ اور موجودہ بگڑی ہوئی انسانیت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ لیکن ابھی منزل اور اسکی پُر پیچ راہوں سے کوسوں دور ہے۔ اور اس کی تو ابھی اِسی منزل تک رسائی ہوئی ہے۔ ے

وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں

انسان فطرةً باطل پسند نہیں

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ "سو اے نبیؐ، آپ باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا رکھیں - وہی اللہ کی فطرت جس پر اُس نے انسانوں کو بنایا ہے - خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں"۔ (سورۃ روم)

معلوم ہوا کہ انسان فطرةً باطل پسند نہیں، بلکہ سیدھے راستے پر چلنا ہی اسکی فطرت ہے - کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اسے حق اور سچائی پر بنایا ہے - ظاہر ہے کہ فطرت بدل نہیں سکتی - جیسا کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی عیاں ہے - حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا - "اگر تمہیں اطلاع ملے کہ ایک پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو تم مان سکتے ہو لیکن اگر یہ سنو کہ ایک شخص اپنی طبیعت سے ہٹ گیا ہے تو اسے نہ مانو - اس لئے کہ وہ اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے جس پر اس کی پیدائش ہوئی ہے -" (مشکوٰۃ شریف)

لہٰذا یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک اور صالح پیدا کیا گیا ہے لیکن وہ دوسروں کے درغلانے، یا ناقص تربیت یا خراب صحبت سے متاثر ہو کر غیر صالح اعمال کا مرتکب ہو سکتا ہے - جیسا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ "آدمی اپنے دوست کا ڈھنگ اختیار کر لیتا ہے، اس لئے تم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ وہ دوست سوچ سمجھ کر بنائے"۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے ایسی ذہنی تربیت دی جائے جس کے نتیجہ میں ان کی عادتیں ایسے سانچے میں ڈھل جائیں کہ اگر اُن سے نادانستہ طور پر بھی کوئی عمل سرزد ہو تو وہ صالح اور پسندیدہ ہی ہو -

اعمال کا انحصار ارادے پر ہے

لیکن انسان سے پاکیزہ اور نیک اعمال کا صادر ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اس کے خیالات اور جذبات بھی پاکیزہ اور صالح ہوں، کیونکہ تمام اعمال کا انحصار،

انسان کے اپنے ارادے اور نیت پر ہے - وہ جو بھی ارادہ کرتا ہے وہ حرکت میں آجاتا ہے - اگر اس کا ارادہ اور نیت ہی ٹھیک نہ ہو تو عمل بھی درست نہ ہو گا- ارادوں کا محرک، انسان کے وہ خیالات اور جذبات ہوتے ہیں جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں- اس لئے انسان کی عملی اصلاح کیلئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اسکے دل و دماغ میں بُرے خیالات اور بے جا خواہشات پیدا ہی نہ ہونے دیں- کیونکہ مثل مشہور ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے- یہی بات تقریباً دو ہزار سال پہلے رومن سینٹ نے ایک استحصال بالجبر کے مقدمہ کی سماعت کے دوران کہی تھی کہ قانون جرائم کے ارتکاب کے بعد سزا دیتا ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو تا کہ ہم یہ کوشش کریں کہ جرائم سرزد ہی نہ ہو سکیں-

یہ انسدادی احتیاطیں اس لئے بھی ضروری ہیں کہ یہ انسان کی جبلّت میں ہے کہ اس کا دل اس کو نیکی اور بدی دونوں راستوں کیطرف راغب کر سکتا ہے- ہمیشہ بھلائی اور نیکی کے راستہ پر چلنا جس شخص کی فطرت ہو اسے "قلب سلیم" رکھنے والا انسان کہتے ہیں- بعض ایسے انسان ہیں کہ ان کا دل ان کو ہمیشہ برائیوں اور گناہوں پر ہی اکساتا ہے- ایسے شخص کے متعلق تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس کا دل "بیمار" ہے- اسے خواہ کتنی ہی تلقین اور نصیحت کیجائے وہ ہمیشہ برا کام ہی کرے گا- اسکے برعکس قلب سلیم یعنی صحت مند دل رکھنے والے انسان کو خواہ کتنا ہی ورغلایا جائے، وہ ہمیشہ نیک عمل ہی کرے گا- لہٰذا بیمار دل والے اشخاص سے نیک اعمال کا صادر ہونا محال ہے تاوقتیکہ دلوں کی بیماری سے انھیں شفاءِ کلی نصیب نہ ہو جائے-

ایک اور طرح کے دل رکھنے والے انسان بھی ملتے ہیں جو کبھی کبھی سیدھے راستہ سے بھٹک کر بُرے اعمال کی طرف راغب ہو جاتے ہیں- مگر جوں ہی انھیں اپنی بے راہ روی کا احساس ہوتا ہے، وہ دوبارہ راہِ راست اور اچھائی کی طرف لوٹ آتے ہیں- ایک مشہور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، جان لو وہ ٹکڑا دل ہے" (بخاری شریف)

جو لوگ ضمیر کی آواز سنتے ہیں انھیں ہدایت، نصیب ہوتی ہے۔ ضمیر کی آواز کی طرف سے منہ پھیرنے والا انسان خواہ کیسا ہی عالم و فاضل اور ذہین و فطین کیوں نہ ہو، فطرت کی آواز نہیں سن سکتا۔ ؎

صبحِ ازل مجھ سے کہا جبرائیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

ایک نازک ترین موقع پر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا تھا کہ قلب سے فتویٰ لینا چاہیئے۔ لیکن جس طرح آنکھوں کی بینائی جاتی رہے اور کانوں کی سماعت ختم ہو جائے تو ان کے فیصلے معتبر نہیں ہو سکتے، ایسے ہی دل اپنی زندگی کھو بیٹھے تو اس کا فیصلہ بھی قابل قبول نہیں کہا جا سکتا۔ وہ زبان ہی معتبر ہے جس میں ذائقہ معلوم کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور قلب بھی وہی زندہ کہلا سکتا ہے جو حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیکی سے قلب سکون پائے اور خدا کی یاد سے اُسے تسکین ہو تو یہ زندگی کی علامت ہے ورنہ مُردہ ہے اور مُردے سے خیر کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا اگر کسی ایسے ہی انسان کو جس کا دل بگڑ گیا ہو شتر بے مہار کی طرح، کشمکش حیات میں تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے تو اس کا راہ راست سے بھٹک جانا بہت آسان ہے۔ ایسا انسان تو کسی بھی ہیجان اور اضطراب سے متاثر ہو جذبات کی رو میں بہہ کر بے قابو ہو سکتا ہے اور پھر کسی وقت بھی وہ انسانوں کو سنگین خطرات سے دوچار کر سکتا ہے۔ ایسے شخص کی مسلسل

نگہداشت، رکھنا اور مناسب تربیت کرنا نہایت ضروری ہے۔

یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ انسان جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اُسے اُسی وقت کرے گا جب اس کی عقل اسے یقین کرا دے کہ اِس کام کے کرنے میں اسی کی بہتری ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی یہ فطرت ہے کہ وہ پہلے سوچتا ہے اور پھر فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں کام کرنا ہے اور فلاں نہیں کرنا۔

ارادہ کی سمت عقیدہ متعین کرتا ہے

لیکن خیالات، جذبات انسان کے اپنے رجحانات، عقیدہ اور کسی مقصد کے تحت ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس کے رجحانات اور نظریات ہی تو ہیں جس سے انسان میں ایک خاص قسم کی فکر اور سوچ پیدا ہوتی ہے۔ اور اس اندازِ فکر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کی عملی زندگی کا دھارا ایک خاص سمت بہنے لگتا ہے۔ اگر دوسرے افراد بھی یہی فکر و نظر اختیار کر لیں تو پھر معاشرہ میں یکسانیٔ کردار پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس نصب العین کی جو اس فکر و نظر کا سبب بنا، ترقی و تکمیل کے لئے فضا سازگار ہو جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہ عقیدہ اور مقصد ہی ہے جو انسانی ذہنوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے اور اِسی کے زیرِ اثر زندگی کے تمام عملی شعبے پروان چڑھتے ہیں۔ بلکہ پورا تمدن ہی اس کا مرہونِ منت ہے۔ ہمارے اِس خیال کی تائید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اِس قول سے ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اسکا عقیدہ ہے۔ صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری ہے کہ چند صحیح اصولوں و مقدمات کا ہم اِس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر متزلزل یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں۔ اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔"

اسی لئے بندہ کو مولا سے تعلق کرنے سے پہلے طلب کے زاویے درست

کرنے کی تعلیم دینا ضروری سمجھا گیا - ایمان کیا ہے ؟ یہ تعلقات کی درستگی اور استواری ہی کا نام تو ہے اور اعمالِ صالحہ اسی کے نتیجہ اور ثمر ہوتے ہیں - ظاہر ہے کہ اگر انسان کے فکر و نظر کو صالح اخلاقی اصولوں کے تابع کر دیا جائے تو وہ اعتدال کی فطری حدود سے تجاوز کر کے، بے راہ روی کا شکار ہونے سے محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ صالح اصولوں کی اساس کے بغیر، انسان کا اپنے خیالات و جذبات پر قابو پانا ممکن نہیں - لہٰذا مقاصد اور بنیادی اصول (یعنی عقائد) جس قدر اعلیٰ و ارفع ہوں گے اسی قدر عمدہ انفرادی اور اجتماعی اخلاقی محاسن پیدا ہوں گے - اور ان کی جتنی پختہ تربیت ہوگی اس قدر معاشرہ میں استحکام اور ہم آہنگی پیدا ہوگی اور اِس طرح انتشار و خلفشار سے نجات مل جائے گی -

.بیمار معاشرہ نہیں افراد ہیں

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ دراصل .بیمار معاشرہ نہیں، افراد ہیں - یعنی معاشرہ کی اصلاح کا راز، افراد کی اصلاح میں مضمر ہے - افراد صالح ہوں تو پاکیزہ اور صالح معاشرہ خود بخود وجود میں آجائے گا - لیکن افراد کی اصلاح کی شرط اولیں خیالات کی پاکیزگی ہے اور وہ صالح اصولوں اور عقاید کی محتاج ہے تاکہ اُن کی روشنی میں انسان نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاسکے اور نیک اور صحیح عمل کرنے کی عادت ڈال سکے - عادات و خصائل کا نام ہی عملی زندگی ہے - جب یہ نیک عادات و خصائل اجتماعی حیثیت حاصل کرلیں تو اِسی کا نام صالح معاشرہ ہے -

لہٰذا اِس حقیقت کے پیشِ نظر، عقل و فہم کا تقاضا ہے کہ افراد کی اصلاح کی طرف فوری توجہ دی جائے تاکہ انکے خیالات و جذبات جو ان کے ذہنوں اور دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، کسی ایسے مرض میں مبتلا ہی نہ ہوں جو بیماری کی شدت، بد پرہیزی اور لاپرواہی کے باعث وبائی شکل اختیار کرلے -

ماہرین کی ہدایات کو نظر انداز کرنا

مہلک ثابت ہوسکتا ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صالح اصول کون مرتب کرے اور وہ کن امور کو پیشِ نظر رکھے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی ذہنوں نے برائیوں کی روک تھام اور صحت مند معاشرتی نظام کے سلسلہ میں نئے نئے فلسفے ایجاد کئے ۔ دورِ کہن سے لے کر عہد جدید کی ترقی یافتہ تہذیب تک ان گنت نظریات اور خیالات کے تانے بانے بکھرے پڑے ہیں۔ اور ان نظریات کی بنیاد پر کتنے ہی انقلابوں کی داغ بیل ڈالی گئی۔ لیکن یہ حقیقت بھی کتنی تلخ ہے کہ ہر مرتبہ نتائج مایوس کن ہی رہے۔ ہر پرانا نظریہ مسترد کرنا پڑا اور پھر ازسرِ نو ایک نیا تجربہ شروع ہوگیا۔

یہ محیر العقول سائنسی ایجادات کا دور ہے۔ ہر نئی ایجاد پر عملدرآمد سے قبل ہم اس کے موجد کی ہدایات و رہبری کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ دیوہیکل خلائی جہاز اور مواصلاتی سیارے، یہ خوفناک راکٹوں، میزائیلوں اور ایٹمی آلات سے لیس لڑاکا طیارے، یہ وسیع وعریض بحری جنگی بیڑے، یہ میلوں میں پھیلے ہوئے کارخانے۔ یہ عالمگیر ریڈیائی اور ٹیلی ویژن نظام، اور یہ بجلی سے چلنے والی ریل گاڑیاں اور برق رفتار مشینیں، کیا ماہرین کے مقرر کردہ رہنما اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کے بغیر ہی رواں دواں ہیں۔ کیا یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ نہیں کہ جب بھی ان ضابطوں کی پابندی سے سرِمو انحراف کیا گیا یا ان کے کسی ایک معمولی سے پرزے نے بھی اپنا فعل صحیح طور پر ادا کرنا چھوڑ دیا تو سنگین اور تباہ کن نتائج بھگتنا پڑے ؎

؎ ابھی حال ہی میں امریکہ کے شہر شکاگو میں ایک طیارہ کے معمولی نٹ کے ٹوٹ جانے اور فنی خرابی کے باعث خطرناک حادثہ پیش آیا جس میں ۲۸۰ مسافر ہلاک ہوگئے۔

غذائی اشیاء اور ادویات ہی کی مثال لے لیجئے ۔ ہر شخص خواہ وہ ماہر طب ہو یا نہ ہو، ہر وقت اس امر کا خیال رکھنے پر مجبور ہے کہ غذا صاف ستھری ہو۔ جراثیم سے پاک ہو، اس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو، خالص ہو، صحت بخش ہو، نافع ہو، مضرت رساں نہ ہو۔ ادویات کے اجزائے ترکیبی کا پتہ ہو، ترکیب استعمال معلوم ہو۔ اس کے فوائد اور مضر اثرات کا علم ہو۔ پھر ان مضر اثرات کا تدارک کیسے ہو۔ پرہیز کن کن چیزوں سے ہو کب استعمال کیجائے اور کتنی مقدار میں ۔ غرضیکہ معمولی معمولی جزئیات تک کا خیال رکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے ۔ یہ سب اہتمام اس اندیشہ سے ہے کہ کہیں جراثیم آلود غذا یا دوا کے باعث یا کسی بد پرہیزی اور ضروری احتیاط نہ کرنے کے سبب جسمانی صحت متاثر نہ ہو جائے ۔ اور اب تو اِس دَور میں ہدایات اور ترکیب استعمال فراہم کرنا عام ہے ۔ بلکہ ایسا نہ کرنا سنگین قانونی جرم ہے ۔

اِنسان، جسم اور روح دونوں کے مجموعہ کا نام ہے ۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ انسان، جسم اور روح دونوں کے مجموعے کا نام ہے ۔ اگر انسان کے جسم سے روح نکل جائے تو اُسے مردہ کہتے ہیں ۔ یعنی لاشے روح کے بغیر جسم کوئی شے نہیں ۔ روح کے نکلتے ہی انسانی جسم بے حس و حرکت ہو جاتا ہے ۔ اور اِس میں تعفن پیدا ہو کر وہ خطرناک جراثیم کی پرورش گاہ بن جاتا ہے ۔ لہٰذا اسے زمین میں دفن کر دینے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں ۔

لیکن جب تک بدن میں روح جاری اور ساری تھی، انسان کے اندر پیدا ہونے والی تمام غلاظتیں بھی خود بخود فطری عمل کے ذریعہ خارج ہوتی رہیں اور اس کو پاکیزہ، صحت مند اور حسین رنگت و نکھار کے ساتھ قائم اور زندہ رکھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ روح کے بغیر بدن قابلِ وقعت ہی نہیں ۔

حیات انسانی کی بقا روح پر منحصر ہے

گویا حیات انسانی کی بقا روح پر منحصر ہے۔ اگر روح بیمار ہو تو معاشرتی فلاح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تجربہ شاہد ہے کہ اخلاقی انحطاط معاشرہ کی جڑوں کو رفتہ رفتہ دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جس سے سارا سماجی نظام کاغذی محل کی طرح زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسمانی صحت کے ادارے بھی، روحانی بیماریوں اور بداخلاقیوں کے باعث انتشار اور تباہی کا شکار ہو کر غیر مفید بلکہ الٹے ہلاکت خیز بن جاتے ہیں اور روح مطمئن ہو تو جسم کی اذیتیں بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

لیکن روح کی جتنی زیادہ قدر و قیمت ہے، اسکو صحت مند بنانے سے اسی قدر غفلت اور لاپرواہی برتنے کا رواج عام ہے۔ جسمانی صحت کے لئے تو اسقدر اہتمام ہے کہ معمولی سی گندگی کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ اور بے شمار حفاظتی تدابیر اور جراثیم کش ادویات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور تفصیلی ھدایات اور ضابطے مرتب کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس روح کے معاملہ میں بے اندازہ غفلت برتی جاتی ہے۔ آخر روحانی امراض کی طرف سے چشم پوشی کا مطلب کیا؟ یہ محض اتفاقی بات تو نہیں ہو سکتی، مطلب بالکل صاف اور واضح ہے۔ اگر روحانی امراض دور ہو جائیں اور بیشتر انسانوں کے اخلاق و افکار درست سمت اختیار کر لیں تو پھر ان بے جا نفسانی خواہشات کی تکمیل کیسے ہو سکے گی جنکو مغربی فلسفیوں نے فطری تقاضا قرار دے دیا ہے۔ چونکہ روحانی تطہیر اور پاکیزہ خیالی ان کی بدعادتوں کی راہ میں سد راہ ہوتی ہیں اس لئے وہ روحانی امراض کے علاج کیطرف سے دانستہ آنکھیں چراتے ہیں۔ اور محض مغربی تہذیب کی برتری کا بھرم قائم رکھنے کے لئے کبھی کبھی خود ساختہ اور من گھڑت نظریات پیش

کر کے دنیا کی توجہ راہ مستقیم سے ہٹاتے رہتے ہیں۔ پھر خود ہی ان میں سے کوئی دوسرا اٹول اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو پہلے نظریے کو مسترد کر دیتا ہے اور ایک نیا شگوفہ چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ اس تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام الناس ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر برائیوں کی تاریک گہری گھاٹیوں میں آجتک بھٹکتے ہی پھرتے ہیں۔

روحانی اور اخلاقی صحت کیلئے بھی اسکے موجد کی طرف رجوع کرنا پڑیگا

دراصل انسان کی روحانی اور اخلاقی صحت برقرار رکھنے کے لئے ہمیں قدرتی طور پر اس کے خالق کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ تمام دوسری سائنسی ایجادات کی طرح انسان بھی اپنے موجد کی ہدایات اور رہنمائی کا محتاج ہے۔ یہ فطرت کے عین مطابق ہی نہیں بلکہ ایک لازوال صداقت اور منطقی حقیقت ہے۔ انسان کی مشینری میں بھی ان گنت پرزے (اعضاء) ہیں۔ ان میں ذہن اور قلب جیسے نہایت نازک اور حساس پرزے بھی ہیں۔ جو بے شمار نفسانی خواہشات، آرزوؤں اور خیالات و جذبات کو جنم دیتے ہیں۔ ان پرزوں کی ساخت، استعداد اور ان کی کارگذاری کی نوعیت اور اہمیت سے خالق کے سوا اور کون واقف ہو سکتا ہے۔ ان کی طاقت اور کمزوریاں بھی وہی بخوبی جانتا ہے۔ جن خرابیوں میں ان کا مبتلا ہو جانا ممکن ہے اسے بھی وہی بخوبی جانتا ہے۔ جن جن بدپرہیزیوں سے ان کی کارگذاری متاثر ہوتی ہے اس کا پورا علم بھی اسی کو ہے کیونکہ وہی ان کا موجد اور معمار ہے۔ بلکہ وہ تو احسن الخالقین ہے۔ اس کے ظاہری قدرتی نظام کو سمجھنے کیلئے سائنسدانوں اور فلسفیوں نے عمریں گذار دیں لیکن ابھی ابتدائی معلومات ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ حال ہی میں ایک حقیر ذرے کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے

تو خود اسی سے خائف اور لرزاں ہے - ابھی تو قدرت الٰہی کی کتنی ہی حقیقتیں ہیں جو آشکارا نہیں ہوئیں - یہ خاک و خون کا پتلا جو آجتک انسانی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا تو وہ انسان کی ان پوشیدہ صلاحیتوں کی ماہیت کیسے معلوم کر سکتا ہے جو خالق کائنات نے اس میں نیابت کے فرائض سرانجام دینے کیلئے بڑی فیاضی سے ودیعت فرمائی ان باطنی قوتوں کا فہم و ادراک صرف اسی کو ہے - اور یہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ہدایات کیصورت میں نوع انسان کو عطا فرمادی ہیں - اب انھیں ہدایات کی روشنی میں انسانی مسائل کا حل کرنا ممکن ہے - لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے ان ہدایات کی طرف سے ہی منہ پھیر لیا - اور محض اپنی نارسا عقل اور محدود علم پر ہی بھروسہ کیا - دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو ابلیس کے نقش قدم پر دانستہ یا نادانستہ طور پر چل رہے ہیں - ابلیس کا گمان بھی تو یہی تھا کہ چونکہ آدم بظاہر محض مٹی کا ایک پتلا ہے، اس لئے اس کو سجدہ کرنے کا حکم میزان عقل پر پورا نہیں اترتا - لہذا اپنے رب کے حکم کو پس پشت ڈال کر نافرمانی کر بیٹھا اور ہمیشہ کے لئے لعنت کا مستحق قرار پایا -

انسان کا خالق خود خدا ہے - وہی سب سے زیادہ علیم و خبیر ہے - انسان کی ان فطری ضرورتوں اور بقائے حیات کے تقاضوں سے وہ کیسے غافل رہ سکتا تھا - ایک معمولی صنعت کار بھی اپنی کاریگری سے بہت خوش ہوتا ہے، ٹوٹ جائے تو آزردہ خاطر ہوجاتا ہے تو پھر اللہ تعالےٰ کب پسند کرے گا کہ انسان راہ راست سے بھٹک جائے - اسکو تو اپنے بندوں سے بہت پیار ہے - چونکہ انسان کی حقیقت اور تمام دنیا کے حقائق کا براہ راست اور کامل علم صرف خدا کو ہے - پس وہی زندگی کی پیچیدہ راہوں میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کا اہل ہے - وہ تو رب العٰلمین ہے، احسن الخالقین ہے اور ہم سب کی پرورش کا ضامن ہے - اس لئے انسان کو بھی دوسری مخلوق کیطرح ہدایت کے لئے اپنا رخ اللہ تعالےٰ ہی کی

طرف کرنا پڑے گا۔ ارشاد فرمایا: وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی یعنی خدا نے ہر چیز کو اندازہ کر کے ہدایت فرمائی۔ پھر فرمایا:

"اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھ کو (انسان) بنایا۔ پھر تیرے اعضاء کو درست کیا۔ پھر تجھ کو (مناسب) اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دیدیا۔ (ان سب کا مقتضاء یہ ہے کہ تم کو) ہرگز مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔" (الانفطار - ۶ تا ۱۰)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اسکے دل میں ڈال دی" الشمس

ان دونوں آیات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر انسان میں نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت اللہ تعالےٰ نے ابتدائے ہی سے رکھ دی ہے اور اسی صلاحیت کی وجہ سے اسے سیدھا اور حق پرستی کا رستہ اختیار کرنے کی ہدایت کیگئی۔ چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت بی بی حوّا کو زمین پر اترنے کا حکم فرمایا گیا تو انھیں جو اولین تاکید اللہ تعالےٰ نے فرمائی وہ یہی تھی کہ زمین پر پہنچکر میری ہدایت کی پیروی کرنا، ارشاد فرمایا:

"ہم نے کہا کہ تم سب جنت سے اتر جاؤ۔ پھر اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اسے نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی غم۔ اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں (یعنے ہدایات) جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں، ان کو ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔" (البقرہ - ۲۱ تا ۲۹)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "تو جو کوئی مری ہدایت پر چلے، نہ وہ (دنیا میں) بہکے گا اور نہ (آخرت میں) بدنصیب ہوگا۔" سورۃ طٰہٰ)

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر انسان کو غم و اندیشہ سے نجات ملنا ناممکن ہے

یہ انکشاف اس امر کی دلیل ہے کہ اگر انسان اپنی زندگی، اللہ تعالےٰ کی ہدایت یعنے اس کے بتائے ہوئے بنیادی اصولوں کے مطابق گذارے تو اس کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ پیش نہیں آئے گا جو اس کے لئے غم و اندیشہ کا موجب ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو اپنے بنانے والے کی مقررہ حدود اور ہدایات سے تجاوز کرے گا، اسے غم و اندیشہ سے نجات ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہمیشہ خطرات سے دوچار ہی رہے گا اسے کبھی ذہنی سکون اور دلی اطمینان نصیب نہ ہو گا۔

انسان کے ارادے اور حکم الٰہی میں جب مطابقت ہو جائے تو اسے توفیق کہتے ہیں۔ اگر یہ توفیق نصیب ہو جائے تو اس کے لئے گویا ہدایت کی راہ کھل گئی لیکن جو نیت ہی نہ کرے اور نافرمانی کرے اسے توفیق نصیب نہیں ہو سکتی۔

"بیشک اللہ تعالےٰ ایسے نافرمانوں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیتا" (المنٰفقون۔۶)

ہدایت کی توفیق سے صرف وہ محروم ہوتے ہیں جو اتباع ہوئے سے گمراہ ہو کر قبول حق کی استعداد ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ "اور کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے اور خدا تعالےٰ (نے) اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو ایسے شخص کو کون ہدایت کرے۔ کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے (الجاثیۃ۔۲۳)

لہٰذا جسے ان ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق ہی نصیب نہ ہو، تو پھر اس کے لئے رہبری اور نجات کے سارے راستے ہی بند ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ الاعراف میں ارشاد فرمایا: اور جس کو اللہ تعالےٰ اپنی ہدایت سے محروم فرما دے، اُسے

کوئی راہ دکھانے والا نہیں (یعنے پھر وہ نامراد ہوا) (الاعراف ۱۸۶)

اِنسان کی غلط فہمی

اِس گمراہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اِس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر آزاد اور خود مختار ہے۔ حالانکہ آزادی کا مطلب تو یہ تھا کہ اِنسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں مگر اس کا یہ مفہوم ہرگز نہ تھا کہ اللہ تعالےٰ کی بندگی اور فرماں برداری سے بھی آزاد ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ نے اسے مطلق العنان بنا کر نہیں چھوڑا۔ اسکو تو نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا ہے تاکہ کائنات کا نظام درست طور پر چلائے۔ جس کی فطرت سعید نہ ہو اور اس پر عطاء و بخشش کے دروازے کھل جائیں تو اس کی عقل میں فتور آجاتا ہے۔ وہ پھر اپنی حقیقت کو بھول کر آقا سے ہمسری کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ گداگر کو شاہ کتنی بھی نعمتوں سے نواز دے "وہ" بہرحال گدا ہی رہتا ہے۔ خلیفہ کا یہ منصب نہیں کہ وہ جس کا نائب ہو، اسی کی مخالفت کرے۔ یہ تو شان بندگی کے بھی خلاف ہے وہ تو اس کے عطا کردہ دستور اور ضابطہ کا پابند ہے۔ اور اسے صرف وہی اختیارات حاصل ہیں جو اسکو تفویض کیۓ گئے ہیں اور وہ اس کا بھی پابند ہے کہ دوسروں کو بھی ان حدود سے تجاوز نہ کرنے دے جو احکم الحاکمین نے مقرر فرمائی ہیں۔ لہذا انسان قرآن پاک کے خدائی ضابطہ کا پابند ہے اور اسے اس پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ اس کا تو نام ہی مسلم یعنے اللہ تعالےٰ کے روبرو سر جھکانے والا رکھا ہے۔

"اور یہ وہی امت ہے جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کی تھی۔ اللہ نے تمہارا نام اِس سے پہلے بھی اور اِس کتاب میں بھی مُسلم (اطاعت کرنیوالا) رکھا ہے۔ تاکہ رسول تم پر نگران ہو اور تم دنیا کے لوگوں پر نگران رہو (البقرہ ۱۰۰)

اس ربانی ضابطے میں اپنی محدود عقل کے زعم میں حرف گیری کرنے یا ان میں اضافہ کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالٰے کی حکومت کا باغی سمجھا جائے گا۔ اور باغی کی سزا صرف منصب خلافت سے معزولی ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کی سرکوبی بھی کی جاتی ہے۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی عبرت ہو اور فتنہ وفساد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے اور پھر سر اٹھانے کی کسی کو جرأت نہ ہو۔

"اور بہت سی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم (ماننے) سے اس کے رسولوں کی سرتابی کی، سو ہم نے ان کے اعمال کا سخت حساب کیا۔ اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی (یعنی ہلاک بالعذاب ہوتے) غرض انھوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارا ہی ہوا۔"
(الطلاق - ۸)

ایک دوسری جگہ فرمایا:

"ہمارا عذاب اترتے وقت) وہ لوگ شہروں کو چھانتے پھرے (موت) سے بھاگتے پھرے کہیں ان کو پناہ نہ ملی"۔[1]

قابل اعتماد ہدایت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے

اس مرحلہ پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر اللہ تعالٰے کو خالق، ماہر تخلیق اور موجد تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی جامع ہدایات تک رسائی کیسے ممکن ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مختلف پیغمبروں کے ذریعے ہدایات کی کئی آسمانی کتابیں نازل فرمائی گئیں۔ پھر ہم کس کتاب پر بھروسہ کریں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں وضاحت کر

---

[1] آج شاہ ایران کی عبرتناک مثال ہمارے سامنے ہے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جا رہے ہیں لیکن کوئی بھی ملک پناہ دینے کو تیار نہیں۔

دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالٰے کی طرف سے جو بھی کتاب نازل ہوئی، اُن سب میں اصول دین ہمیشہ مشترک ہی رہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی اِس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہے۔ "اللہ تعالٰے نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس

کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا۔ اور جس کا حکم ہم نے آپ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسےٰؑ کو حکم دیا تھا (اور ان امتوں کو کہا تھا)، کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اِس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ (الشوریٰ-۱۳)

یعنی ہر نبی نے بنیادی طور پر ہمیشہ اللہ تعالٰے کے مقرر کردہ اصولوں ہی کو پیش کیا۔ لیکن زمانہ کی دست بُرد سے پہلی آسمانی کتابوں میں آمیزش ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی کہ الگ الگ مذاہب بن گئے۔ چونکہ اب کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی اور آسمانی کتاب نازل ہونی ہے لہٰذا موجودہ امت کو تمام سابقہ آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم میں بھی یہی مصلحت کارفرما ہے کہ اصول دین ہمیشہ ایک ہی رہے — چونکہ قرآن خدا کی آخری کتاب ہے، اس لئے اس کی حفاظت کی ضمانت بھی اللہ تعالٰے نے خود اپنے اوپر لے لی۔ اس لئے اپنے فرشتوں کی نگرانی میں اِس کتاب کو بحفاظت اپنے پیغمبر تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔ ارشاد فرمایا:

"ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو تو (اس طرح اطلاع دیتا ہے کہ) اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے۔ اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے (تاکہ ظاہری طور پر بھی) اللہ تعالٰے کو معلوم ہو جائے کہ اِن فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام (رسول تک) بحفاظت پہنچا دیئے۔"

اور سورۃ القیٰمہ میں ہے کہ : "اور اے پیغمبرؐ! قبل اختتام وحی قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی لیں - ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور پڑھوا دینا جب ہم اُسے پڑھیں تو آپ اُسکی پیروی کریں - پھر اس کا بیان کرا دینا یاد کرا دینا) ہمارے ذمہ ہے"۔

(القیٰمہ : ۱۶ تا ۱۹)

علاوہ ازیں دُنیا کے ہر گوشے میں قرآن کریم کے لاتعداد حافظ ہمیشہ سے موجود رہتے آئے ہیں لہٰذا اس کتاب الٰہی کی بنیاد پر جو بھی رہبری میسر آئے گی وہ یقیناً اُسی اصلی صورت میں ہوگی جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھی جبکہ یہ کتاب نازل فرمائی گئی - اس ربانی ہدایت کی اہم بات یہ ہے کہ یہ ازلی اور ابدی ہے اور کسی وقت اور مقام کی پابند نہیں، اس لئے یہی آسمانی کتاب سب سے زیادہ صحیح، معتبر اور قابل اعتماد ہے - اس اعتماد کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس شریعت کو دینے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے مکمل حالات بھی سیرت کی مستند کتابوں میں موجود ہیں اور اللہ تعالےٰ کے ہر حکم کی شان نزول بھی تفاسیر میں محفوظ ہے، نیز اس کی صحت کے متعلق کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ جیسے متقی و پرہیزگار، اور قابل اعتماد گواہ بھی موجود ہیں، جنھوں نے ان ہدایات پر خود اللہ تعالےٰ کے نبیؐ کو عمل کرتے دیکھا اور خود صحابہ کرامؓ نے ان پر سختی سے عمل کیا اور دوسروں کو بھی ان پر پوری طرح عمل کرنے کی تاکید فرمائی -

یہ تمام حقائق اب تاریخ کا حصہ ہیں اور ان کی تفصیلات اور صحت کی طرف ہر وقت رجوع کیا جا سکتا ہے -

قرآنی ھدایات کے نفاذ کی ذمہ داری کس پر ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن پاک میں بیان کردہ ھدایات ہی قابل اعتماد ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر ان پر عملدرآمد کیوں نہیں کیا جاتا اور اس عدم تعمیل اور کوتاہی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ یہ تمام ہدایات اللہ تعالےٰ نے آنحضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک جلیل القدر فرشتے حضرت جبرائیل کی وساطت سے بذریعہ وحی پہنچائیں۔ جنھوں نے اپنے صحابہ کرام رضؓ کو ان ہدایات سے آگاہ فرمایا اور وہ سب کاتبان وحی کے ذریعہ قلمبند کرا دی گئیں۔

آنحضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان جملہ ھدایات پر خود عمل کر کے اعلیٰ ترین عملی نمونہ بھی پیش کیا جسے خود خالقِ کائنات نے پسند فرمایا اور آپ کے خلق کو خلق عظیم قرار دیا اور آپ کے عمل کو بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) فرمایا تاکہ ثابت ہو سکے کہ قرآن کریم کی یہ تمام ھدایات محض کوئی فلسفیانہ بات نہیں بلکہ قابل عمل بھی ہیں جس کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ قائم کر کے بھی دکھا دیا۔ ثابت ہوا کہ ہدایت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، اس کا بہترین عملی نمونہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہے اور صحابہ کرام رضؓ کی جماعت اس کا بیّن ثبوت ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات خود بخود سامنے آگئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایات کا مستند ضابطہ درکار ہے تو وہ کتاب الٰہی (یعنی قرآن کریم) ہے اور جو شخص، دینِ اسلام پر چلے گا ہدایت بھی اسی کو نصیب ہوگی۔

"پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو بیشک وہ ہدایت پر ہو گئے۔" (۳-۱۹)

اور اس کتاب پر اعتماد کرنے کے لئے ہمیں اللہ تعالےٰ کے فرشتوں، اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی یقین کرنا پڑے گا ورنہ قرآن اور اللہ کے رسول کی صداقت پر یقین کیسے قائم رہے گا۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ہدایت کے متلاشیوں کے لئے بنیادی اصول کے طور پر اللہ تعالےٰ، اس کے فرشتوں اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب پر لازمی یقین لانا ہوگا۔ اگر یہ احساس موجود نہ ہو تو پھر بات آگے نہیں بڑھ سکے گی اور نہ ہی زندگی کی شاہراہ پر اگلا قدم اٹھ سکے گا۔

رہا یہ سوال کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے اس دور کے مسلمان ویسے ہی صالح معاشرہ قائم کرنے میں کیوں ناکام ہیں تو یہ ایک علیحدہ بات ہے جس سے ان اصولوں کی سچائی اور افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اسکے رسولؐ کے پیش کردہ نمونے کے مطابق عمل کیا گیا تو اس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہونے میں کچھ دیر نہیں لگی۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے مسلمان ان اصولوں پر پوری طرح، اور خلوص نیت سے عمل پیرا نہیں ہیں، ورنہ آج بھی وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور ویسا ہی پاکیزہ معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفائے راشدین کے دور میں دیکھنے میں آیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مستقبل کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرب

قیامت مسلمانوں کی وہی حالت ہو جائیگی جو تند و تیز دھارے پر بہنے والے خس و خاشاک کی ہوتی ہے اور دنیا کی قومیں انھیں اچکنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گی۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کے دریافت کرنے پر اس زوال کا سبب یہ فرمایا تھا:

حب المال و کراھت الموت :

یعنی تم میں مال کی محبت اور موت سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ یہ آپؐ کی پیشینگوئی اس دور کی مسلم اقوام کے لئے کس قدر صحیح اور عبرت آموز ہے سابقہ امتوں کی ہلاکت کا سبب یہی تھا کہ انھوں نے اللہ تعالےٰ کی ہدایات کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور نظر انداز کر دیا جس کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا: " سو انھوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند کیا، پس ان کو عذاب سراپا ذلت کی آفت نے پکڑ لیا ان کی بدکرداری کی وجہ سے" (حٰمٓ السجدہ ۱۷)

دور حاضر کے انسانوں کے حالات بھی بظاہر ان سے مختلف نہیں ہیں حالانکہ بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا ہمیشہ سے ہی ایک مقررہ اصول چلا آتا ہے

" اور اگر تم روگردانی کروگے تو خدائے تعالےٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا۔ پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے"۔ (محمد: ۳۸)

اسی طرح بنی اسرائیل کی عبرتناک مثال قرآن پاک میں موجود ہے :—

" اگر اچھے کام کرتے رہوگے تو اپنے ہی نفع کے لئے اچھے کام کروگے اور اگر (پھر) تم برے کام کروگے تو بھی اپنے ہی لئے پھر جب پچھلی بار کی میعاد آئے گی ہم پھر دوسروں کو مسلط کر دیں گے تاکہ (مار مار کر) تمہارے منہ بگاڑ دیں اور جسطرح وہ لوگ

مسجد (بیت المقدس) میں گھسے تھے یہ لوگ بھی اس میں گھس
پڑیں اور جس جس پر ان کا زور چلے سب کو برباد کر ڈالیں —
عجب نہیں کہ تمہارا رب رحم فرما دے۔ اور اگر تم پھر وہی (شرارت
اور فساد) کرو گے، تو ہم بھی پھر وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو
(ایسے) کافروں کا جیل خانہ بنا رکھا ہے۔" (بنی اسرائیل ۸/۷)

یعنی اگر بنی اسرائیل کی طرح وہ بھی مفسد بن گئے اور خدا کی ھدایت سے انحراف کی راہ اختیار کرلی، تو مسلمانوں کا بھی وہی حشر ہوگا جو بنی اسرائیل کا ہوا اور ہلاکت و شرمندگی ان کا بھی مقدر بن جائے گی۔ نیز ارشاد فرمایا:

"کیا ہم اگلے لوگوں کو ہلاک نہیں کر چکے پھر پچھلے کو بھی ان ہی کے
ساتھ ساتھ کر دیں گے۔ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے
ہیں" (المرسلٰت: ۱۶/۱۷)

رب علیم و خبیر نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ ایمان عمل کو پکارتا ہے "اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار کر کے رکھا ہے۔" (بنی اسرائیل: ۱۳)

یعنی عمل اور نتیجہ دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر قرآن پاک کی ہدایت پر عمل نہیں کیا جائے گا تو سیدھا راستہ اختیار کرنا ناممکن ہوگا پھر وہ گمراہ ہو کر دردناک سزا کے مستحق ہو جائیں گے۔

"بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا
ہے اور ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں، یہ خوشخبری دیتا
ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ
آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم نے ان کے لئے ایک دردناک

سزا تیار کر رکھی ہے" (بنی اسرائیل ۹ - ۱۰)

خالق سے بہتر کون جانتا ہے کہ انسان کی غرض و غایت دنیا نہیں آخرت ہے۔ ارشاد فرمایا:

"یہ دنیوی زندگی محض چند روزہ ہے اور (اصل) ٹھہرنے کا مقام تو آخرت ہے" (المومن — ۴۰)

اور یہی روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہے کہ دنیوی مال و متاع فانی ہے۔ تلاش و جستجو تو باقی رہنے والی کی ہے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

"جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہے ہم اس کو (آخرت کی) کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو کچھ دنیا دے دیں گے اور آخرت میں اسکا کچھ حصہ نہیں۔ (الشوریٰ — ۲۰)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ پچھلی امتوں کے مایوس کن نتائج کے باوجود، امتِ مسلمہ سے بہت پُرامید ہے۔ سورۃ الزخرف میں ہے کہ:

"اور اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ تمام انسان ایک ہی طریقہ کے (یعنی امتِ واحدہ) ہو جائیں گے، تو جو لوگ خدا کیساتھ کفر کرتے ہیں ان کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے جس پر چڑھا (اترا) کرتے اور اُن کے گھروں کے کواڑ، اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، — (چاندی کی کر دیتے) اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی کر دیتے"

(الزخرف: ۳۵)

اس امت کو "خیرالامت" کے خطاب سے نوازا ہے یہ اس کے پیارے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت ہے۔ جس کی امتیازی شان یہ ہے کہ:

"تم بہترین امت ہو جو ظاہر کئے گئے لوگوں کے لئے، تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر"

(آل عمران : ۱۱۰)

اس امُت کی کتاب بھی اللہ تعالےٰ کی آخری کتاب ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں بھی پوری کر دی ہیں۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ اب نائب اور خلیفۃ الارض کا مقصد پورا کرنے والی امت کا ظہور ہو چکا ہے اب اس کے بعد کوئی اور امُت قیامت تک آنے والی نہیں۔

لہٰذا منشائے ایزدی کو پورا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا جھنڈا اطراف عالم میں ہر جگہ بلند کرنا اور اللہ کی حاکمیت تمام جہان میں نافذ کرنا، اور پرامن اور پاکیزہ معاشرہ بلکہ وحدت انسانی قائم کرنا اور شاہِ کونین ؐ کے مشن کو پورا کرنا اب اسی امُت کی ذمہ داری ہے۔

راہ ہدایت میں رکاوٹیں

نیابت کے فرائض کی ادائیگی اور اللہ تعالےٰ کی ھدایات کے مطابق صالح زندگی گذارنے کی راہ میں رکاوٹیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ خالق کائنات نے ان کی بھی نشان دہی فرما دی اور انسان کو آگاہ کر دیا کہ ان سے ہمیشہ ہشیار رہنا۔ جس طرح جسمانی امراض کے لئے ڈاکٹر پرہیز کرنے کی تاکید کرتے ہیں، اسی طرح روحانی امراض کے علاج میں بھی پرہیز ضروری ہے جن میں دو زیادہ اہمیت کے حامل ہیں یعنی شیطان اور نفس۔

(۱) **شیطان** } یہ ابلیس ہی تو ہے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ چیلنج دے بیٹھا کہ جس انسان کی تخلیق کے باعث اس کو یہ ذلت

اٹھانی پڑی، تو وہ بھی ہر ممکن طریقہ سے اسے اللہ تعالےٰ کی راہِ ہدایت سے روکنے کی سر توڑ کوشش کریگا اور اسے گمراہ کر کے چھوڑے گا۔ چنانچہ اس مقصدِ بد کی نیت سے شیطان نے مہلت مانگ لی تاکہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ انسان بھی نافرمان اور ناشکرا ہے اور یہ کہ نیابتِ الہٰی کے لئے انسان کو منتخب کرنا ایک غلط فیصلہ تھا۔ جب یہ مہلت مل گئی تو ابلیس لعین نے یہ دھمکی بھی دے دی۔

"چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے تو اب میں بھی تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے سے، اور پیچھے سے دائیں سے اور بائیں سے ہر طرف سے انہیں گھیروں گا، تو ان میں سے اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا" (الاعراف: ۱۶-۱۷)

رب ذوالجلال نے ابلیس کے اس متکبرانہ دعوے کو حقارت سے ٹھکرا دیا:

"فرمایا دور ہو جا تو ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا تو بیشک سب کا بدلہ جہنم ہے بھر پور سزا" (بنی اسرائیل: ۶۳)

نیز ابلیس کو یہ جتا دیا کہ قیامت تک کی طویل مہلت ملنے کے باوجود اللہ تعالےٰ کے مخلص بندوں پر اس کا داؤ نہیں چل سکے گا اور وہ ان کو زبردستی گمراہی میں نہیں ڈال سکتا۔ ارشاد فرمایا:

"اور پھسلا دے ان میں سے جس پر قابو پائے، اپنی آواز (دعوت) سے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال اور بچوں میں بھی شریک ہو جا اور ان کے وعدوں کے جال میں پھانس لے اور شیطان کا وعدہ فریب کے سوا کچھ نہیں۔ بیشک جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ قابو نہیں چل سکے گا، اور تیرا رب کافی ہے کام بنانے والا (شیطان کے وسوسوں سے محفوظ

رکھنے کے لئے)   (سورہ بنی اسرائیل، ۶۴ تا ۷۷)

مفسرین کا خیال ہے کہ در اصل ابلیس کا چیلنج اللہ تعالےٰ کو نہیں بلکہ اولاد آدمؑ کو تھا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ان کو فریب دیگا تاکہ وہ صراطِ مستقیم سے دُور جا پڑیں، اور اللہ تعالےٰ کے فرماں بردار اور شکر گذار بندے نہ بن سکیں تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ انسان ابلیس کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ کا خلیفہ بننے کا اہل نہ تھا لیکن رب علیم وقدیر نے اپنے بندوں کو شیطان کے ہر ممکن ہتھکنڈوں سے بھی، جو وہ ان کے خلاف استعمال کرنے کی نیت رکھتا تھا پہلے ہی آگاہ فرما دیا۔

یعنی (۱) شیطان کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ زبانی طور پر انسان کو بدکاری اور گمراہی کی دعوت دے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو آواز بھی انسان کے منہ سے منشائے الٰہی کے خلاف نکلے گی وہ شیطان ہی کی آواز ہوگی مثلاً بدگوئی۔ غیبت۔ جھوٹ بولنا۔ منافقانہ گفتگو۔ گانا بجانا۔ وغیرہ سب اسی میں داخل ہیں۔

(۲) اگر شیطان اپنے زبانی داؤ میں ناکام رہا تو پھر پوری قوت سے لشکر کشی کر کے انسانوں کو ہر طرف سے گھیرے گا تاکہ صراط مستقیم اختیار نہ کر سکیں، مثلاً معصیت کے کاموں میں لڑائی جھگڑا کرا کر اور ہر طرح کی مشکلات کا ڈراوا دے کر، کیونکہ شیطان چھپ چھپ کر وار کرتا ہے۔

(۳) اگر انسان دوسرے وار سے بھی بچ نکلا تو پھر مال حاصل کرنے کے حرام اور ممنوعہ طریقے بتائے گا اور مال کو حرام مقاصد میں استعمال کرنے کی رغبت دلائے گا مثلاً شراب، جوا، بدکاری، ناچ گانا وغیرہ۔ اسی طرح زنا اور دیگر ناجائز طریقوں سے اولاد حاصل کرنے کا سبق پڑھا کر شیطان ان کی اولاد میں بھی شریک بن جائے گا۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ

نے فرمایا کہ مال اور اولاد انسان کے لئے فتنہ اور بڑی آزمائش ہیں۔

(۴) آخری حربہ سب سے زیادہ پرخطر ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوّا بھی دھوکا کھا گئے۔ یہ حربہ ہے خیرخواہی کے سبز باز کی آڑ میں فریب دینا لیکن چونکہ حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوّا اللہ تعالےٰ کے مخلص بندے تھے اس لئے انہیں جونہی اپنی لغزش کا احساس ہوا، فوراً نادم ہوئے اور توبہ کر لی۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کو علم تھا کہ ان کا ارادہ نافرمانی کا نہ تھا جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں فرمایا کہ:

"وہ بھول گئے، ارادہ ہرگز نہ تھا" (آیۃ ۱۱۵)

آجکل بھی مغربی تہذیب کی فریب کاریاں اور ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر ہماری ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں نے پردہ کو خیرباد کہہ دیا ہے، اور اپنی زینت کو عریاں کر کے فحاشی اور بدکاری کے دروازے کھول دیئے ہیں، اور اس طرح انسانوں کو سربازار دعوت گناہ دی جا رہی ہے۔ یہ شیطان کا وہی چالاک ہتھکنڈہ ہے جو اس نے آدم و حوّا کے خلاف استعمال کر کے ان کے نورانی لباس اترواکر، ان کی شرم کی چیزیں ان پر ظاہر کر دی تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان انسان کا کھلا اور ازلی دشمن ہے اور قیامت تک دشمن ہی رہے گا لھٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہروقت اس کے پُرفریب ہتھکنڈوں سے چوکنا رہیں اور برائیوں سے دامن بچائیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے کا ڈھنگ اختیار کریں، ورنہ اندیشہ ہے کہ اگر متواتر نافرمانی کی گئی تو ان پر شیطان مسلط نہ ہو جائے۔

"اور جو شخص اللہ کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، سو وہ (ہروقت) اسکے ساتھ

رہتا ہے اور وہ ان کو راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں اور یہ لوگ خیال
کرتے ہیں کہ وہ راہِ (راست) پر ہیں، یہاں تک کہ جب ایسا
شخص ہمارے پاس آئے گا تو (اس شیطان سے) کہے گا کہ کاش
میرے اور تیرے درمیان (دنیا میں) بعد المشرقین ہوتا (تو تو
بُرا ساتھی تھا اور (ان سے کہا جائے گا) جب تم (دنیا میں،
کفر کر چکے تو آج یہ بات تمہارے (کچھ) کام نہ آئے گی تم (اور
شیاطین (عذاب میں شریک ہو۔" (الزخرف: ۳۷ تا ۳۹)

اور پھر جب مبتلائے عذاب ہوگا تو کہے گا:۔

"اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان
دکھا دیجئے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا۔ ہم ان کو اپنے پیروں تلے
مل ڈالیں تاکہ وہ ذلیل و خوار ہوں۔" (حٰمٓ السجدہ - ۲۹)

اور غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی علیم و خبیر ذات نے ہمیں پہلے ہی آگاہ فرما دیا ہے

"اور وہ (شیطان) تم میں سے ایک کثیر مخلوق کو گمراہ کر چکا
(ہے) سو کیا تم نہیں سمجھتے تھے۔" (یٰسٓ - ۶۲)

لھذا ہماری عافیت اسی میں ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی لغزش ہو بھی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کے طریقہ کو مشعلِ راہ بنا کر ندامت کا اظہار کر کے توبہ کے طلب گار ہو جائیں اور اللہ تعالےٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی گذارنے کا قرینہ اختیار کر لیں۔ پھر اس کو آخرت میں نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی غم اور اس طرح اللہ جل شانہٗ کی یہ بات سچ ثابت ہو جائے گی کہ انسان ہی زمین میں اس کا خلیفہ اور نائب بننے کا مستحق ہے۔ دراصل انسان کا منصب اور نصب العین ہی یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اللہ تعالےٰ کی بات ہی کو سچا کر دکھائیں

اور ہر مقام پر اور ہر زمانے میں اس کا ہی نام بلند رکھیں کیونکہ ہمارا تو نعرہ ہی یہ ہے "اَللّٰہُ اَکْبَر"

نفسِ امّارہ دوسری بنیادی چیز جو انسان کو ہدایت کا راستہ اختیار کرنے سے باز رکھتی ہے وہ اس کا نفس ہے ۔ جسے نفس امّارہ بھی کہتے ہیں ۔ یہ نفس ہی تو ہے جسکا خود ابلیس جیسا عیار اور مکار بھی شکار ہو گیا ۔ نفس نے اسے تکبر پر اکسایا کہ تو آدمؑ سے افضل ہے کیونکہ تو آگ سے بنایا گیا جو بلندی کیطرف اٹھتی ہے جبکہ آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی جو ہمیشہ پستی میں رہتی ہے ۔ چنانچہ وہ اپنے خالق و مالک کی نافرمانی کی جرأت کر بیٹھا اور ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ ۔ اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کا مستحق ٹھہرا ۔ ارشاد فرمایا :

" پس تو یہاں سے اُتر جا ۔ تجھے حق نہیں کہ یہاں اپنی بڑائی کا تکبر کرے نکل جا بے شک تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں ۔" (الاعراف)

اس ذلت وخواری کے باوجود نفس نے ابلیس کو ندامت کی توفیق نصیب نہ ہونے دی بلکہ اس کی گمراہی میں مزید اضافہ کرا دیا ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ جب عزیز مصر کو معلوم ہو گیا کہ زلیخا نے جو الزام لگایا تھا وہ اس سے پاک ہیں ۔ تو آپ نے اپنی بے گناہی پر ناز نہیں کیا اور گناہ سے بچنے کو اپنے نفس کی خوبی قرار نہیں دیا بلکہ اس کو اللہ تعالےٰ کے فضل و رحمت پر محمول کیا آپ نے فرمایا

" اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں بتاتا بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے " (سورۂ یوسف آیۃ ۵۳)

بقول حضرت خواجہ حسن بصریؒ نفس سے بڑھ کر دنیا میں منہ زور اور بدلگام

جانور کوئی نہیں۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ خواہشاتِ نفس کو ترک کئے بغیر وصلِ حق ممکن نہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی عبادت خواہشات نفسانی کا ترک کرنا ہے۔ اسکی دو قسمیں ہیں : اوّل لذت اور شہوت ، دوم : جاہ طلبی۔

خواہشات کا غلبہ ہو تو نفس کو عجیب عجیب شرارتیں سوجھتی ہیں تمام تر ذہانت اپنے گناہوں کا جواز پیدا کرنے پر صرف ہونے لگتی ہے۔ عقل کے ذریعہ گناہ کو ثواب اور ناجائز کو جائز ثابت کیا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

"اور جو شخص اللہ کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ (ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ ان کو راہ حق سے روکتے ہیں اور یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ (راست) پر ہیں۔" (الزخرف : ۳۷)

پس اللہ تعالےٰ نے انسان کو پہلے خیر و شر، طاعت و معصیت سے آگاہ فرمایا تاکہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ پھر اسے خواہشات نفسانی سے پاک رہنے کی تاکید فرمائی جیسا کہ سورۃ الشمس میں ارشاد فرمایا :

"پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اس کے دل میں ڈالی بیشک مراد کو پہنچا جس نے اُسے (یعنی نفس کو) ستھرا کیا (برائیوں سے) اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔" (آیۃ: ۸ تا ۹)

اسی طرح ایک اور جگہ رب ذو الجلال کا ارشاد ہے کہ :

"تو وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی (یعنی دنیوی رنگ رلیوں میں ڈوبا رہا)، تو بیشک جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہوتے سے ڈرا

اور نفس کو ہوا و ہوس (حرام خواہشات) سے روکا تو بیشک
جنت ہی اسکا ٹھکانا ہے"۔ (سورۃ النزعت: آیۃ ۴۰ تا ۴۱)

ایک اور جگہ حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی:

"اور آئندہ بھی نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرنا (اگر ایسا
کروگے) وہ خدا کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گا"۔ (ص ۲۶/۳۸)

یعنی یہ نفسِ امارہ انبیاء کو بھی بہکا سکتا ہے تو پھر عام انسانوں کا کیا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ ایک جگہ فرمایا:

"یہ لوگ صرف بے اصل خیالات اور اپنے نفس کی خواہش پر چل
رہے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت
آچکی ہے۔ کیا انسان کو اس کی (ہر) تمنا مل جاتی ہے۔ سو
خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا"۔ (النجم: ۲۳ تا ۲۵)

یعنی یہ سب نفسانی خواہشات اور بے جا تمنائیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ آخرت سے بے فکری ہے، ورنہ نجات کی فکر ضرور کرتا۔ نفس امارہ نے اسے صرف دنیوی جاہ و حرص میں الجھا رکھا ہے اور آخرت سے غافل کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"(اے منکرو!) ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور
آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو"۔ (القیٰمۃ: ۲۰/۲۱)

مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے کہ ایک بار کچھ لوگ جنگل سے گذر رہے تھے تو انہیں وہاں ایک بہت بڑا اژدہا بے حس و حرکت پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچے اور وہاں سے رسّے اور ایک گاڑی لے آئے اور اژدہے کو رسّوں میں جکڑ کر گاڑی میں

لادا، اور گاؤں لے گئے۔ وہاں اسے ایک میدان میں پھینک دیا جب موسم گرما آیا اور دھوپ تیز ہونے لگی تو اژدہا آہستہ آہستہ ہوش میں آگیا اور جو لوگ ارد گرد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے ان کے لئے خطرہ کا باعث بن گیا۔ مولانا رومیؒ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان کا نفس بسا اوقات عبادت اور مجاہدے سے بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ نفس مرگیا۔ لیکن درحقیقت وہ مرا نہیں ہوتا جب اسے ترغیب یا ہوس کی گرمی پہنچتی ہے تو وہ پھر زندہ ہو کر آمادۂ فساد و ہلاکت ہو جاتا ہے اس لئے نفس سے کبھی دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ یہی حال بعض انسان نما شیطانوں کا ہے کہ جب اسے ہوس کی گرمی پہنچتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے اور زنجیریں توڑ کر ہلاکت و بربادی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ حتےٰ کہ اتباعِ ہوٰی کی بدولت قبولِ حق کی استعداد ہی سے محروم ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

"اور کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنا رکھا ہے اور خدائے تعالےٰ نے، اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو ایسے شخص کو کون ہدایت کرے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے" (الجاثیہ : ۲۳)

ہدایت کے پانچ بنیادی اصول :

رہنما اصولوں کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق جو کچھ پہلے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہے کہ قرآن کریم ہی وہ مستند آسمانی کتاب ہے جس پر ہم اپنی رہنمائی کے لئے مکمل بھروسہ کر سکتے ہیں - یوں تو سارا قرآن ہی ہدایت اور حکمت کا خزانہ ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا :

"یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب ہے اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین کرنے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے۔" (الجاثیہ — ۲۰)

مگر چند اصول بنیادی نوعیت کے ہیں کہ اگر ان پر ہمارا پختہ یقین نہ ہو تو پھر ہدایت نصیب ہونا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے - گذشتہ وضاحتوں کی روشنی میں اللہ تعٰ کے اس حکم کی حکمت اب بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے : ارشاد فرمایا :

"اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا[۱] کا - اسکے فرشتوں[۲] کا اس کی کتابوں[۳] کا - اس کے پیغمبروں[۴] کا اور آخرت[۵] کا انکار کریگا، وہ سخت گمراہ ہوا" (سورہ النساء : ۱۳۶)

یعنی ھدایت کا دارومدار خدا پر یقین - خدا کے فرشتوں پر یقین - خدا کی کتابوں پر یقین - خدا کے پیغمبروں پر یقین اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر یقین پر ہے

یہ اصول یا عقائد خمسہ اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ ان پر غیر متزلزل یقین رکھنے سے انفرادی اور اجتماعی تربیت کے ذریعہ زندگی کو احسن طریقہ پر انجام دینے کے لئے تیار کیا جاتا ہے

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اخلاق کا تعلق خدا اور مخلوق دونوں سے

ہے۔ دینِ اسلام انسان کی تربیت ہی اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ اور اس کے بندوں کی فلاح و بہبود میں صرف کر دے اور یہی نیکی اور پرہیزگاری کی اصل بنیاد ہے۔

عقائدِ خمسہ کی حکمت

اگرچہ یہ پانچوں اصول ہدایت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان میں بھی دو اس قدر اہم ہیں کہ ان پر کامل یقین کے بغیر اصلاح کردار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اللہ تعالےٰ پر یقین اور روزِ آخرت پر یقین، جیسا کہ سورۂ البقرہ میں ارشاد ہوا:

"بیشک ایمان والے، نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ جو کہ سچے دل سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں، اُن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی غم۔" (سورہ البقرہ: ۶۲)

اس آیتِ کریمہ میں دو بنیادی اصولوں کی اہمیت جتا دی گئی ہے جن پر ہدایت اور غم و اندیشہ سے نجات کا انحصار ہے:

(۱) اللہ تعالےٰ پر یقینِ کامل (۲) آخرت پر پختہ یقین

رہا اعمالِ صالح کا ذکر تو یہ واضح ہے کہ جب تک انسان اللہ تعالےٰ پر سچا ایمان اور یومِ آخرت پر یقین نہیں رکھتا اس وقت تک اس کا اعمالِ صالحہ پر ہمیشہ قائم رہنا دشوار ہے۔ چنانچہ ایک آیت میں اس طرح ارشاد فرمایا:

"جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو صالح ہیں۔" (آل عمران: ۱۱۴)

اس آیت میں بھی اللہ تعالےٰ پر ایمان اور یوم آخرت پر یقین کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا ہے کہ یہی سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ باقی تین عقائد کا نمبر بعد میں آتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ بھی انہی دو عقائد میں شامل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا اللہ پر ایمان نہیں تو وہ اس کی کتابوں، اسکے رسولوں اور اس کے فرشتوں پر کب یقین لائے گا اور اسی طرح اگر کسی کو اعمال کی بازپرس کے دن کا یقین نہیں تو وہ اعمال صالحہ کی کب فکر کرے گا۔

اللہ تعالیٰ پر یقین

اللہ تعالےٰ پر پختہ اور غیر متزلزل یقین ہی وہ مؤثر محرک ہے جس کے زیر اثر زندگی کے تمام عملی شعبے پروان چڑھتے ہیں۔ یہی وہ نورانی مشعل راہ ہے جسکی روشنی میں انسان اپنی زندگی کی کٹھن منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کرتا ہے۔ اسی بنیادی سچائی اور حقیقت کے تخیل سے انسانی اعمال صالحہ صحیح رُخ اختیار کرتے ہیں اور اسی کے تصور سے معاشرہ میں مرکزیت اور یکسانی کردار پیدا ہوتی ہے کیونکہ ہم سب ایک ہی اللہ کے بندے ہیں۔

مذہبی اصطلاح میں اس کو توحید کہتے ہیں اور اس سے بظاہر یہی مراد ہے کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" یعنی اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں، جو عبادت کے لائق ہو لیکن معنویت اور مقصدیت کے لحاظ سے اس کا مفہوم بہت وسیع اور دُور رس نتائج کا حامل ہے۔

وحدانیت کا صرف یہی مطلب نہیں کہ اللہ ایک ہے بلکہ اس بات پر کامل یقین کہ وہی اس کائنات کا تنہا خالق اور مالک اور حاکم ہے۔ اسی کے قائم رکھنے سے یہ کائنات قائم ہے اور اسی کے چلانے سے یہ چل رہی ہے۔ وہ وحدہٗ

لاشریک ہے اس جیسا کوئی بھی نہیں لیکن اسقدر بے مثل ہونے کے باوجود رب العالمین نے انسان کو اپنی موجودگی کے احساس سے کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت خالی نہیں چھوڑا - وہ ہر جگہ موجود ہے چنانچہ ارشاد فرمایا :

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ	"میں تمہارے ساتھ ہوں جہاں
(الحدید ۴)	کہیں بھی تم ہو۔"

اور انسان کو مزید تسلی دینے کے لئے فرمایا :

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ	اور ہم تو تمہاری شہ رگ سے
حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قٓ : ۱۶)	بھی زیادہ قریب ہیں"

پھر یہ احساس ختم نہیں کر دیا بلکہ یہ بھی وضاحت فرمادی کہ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہونے کے علاوہ میں تمہاری ہر فریاد اور ہر التجا پر ہمیشہ پوری طرح متوجہ رہتا ہوں - فرمایا :

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ	(البقرہ ۱۸۶)	" میں تو تیرے قریب ہوں میں تو ہر
قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ		پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں

وہ ہر بات سے باخبر ہے اور ہمارے ہر کام کو اور ہر عمل کو خود براہ راست دیکھ رہا ہے - چنانچہ اللہ تعالٰے نے ارشاد فرمایا :

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝	" بلاشبہ تیرا پروردگار تو تجھے ہر دم
(الفجر - ۱۴)	جھانک لگائے تک رہا ہے۔"

اور پھر یہی نہیں بلکہ ہمارے دلوں کے اندر جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں ، وہ ان سے بھی بخوبی واقف ہے ، ارشاد فرمایا :

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ	" تم اپنی بات آہستہ کہو یا اسے پکار
اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝	کر کہو وہ سینوں کی (چھپی) باتوں کو
(الملک : ۱۳)	جانتا ہے۔"

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (حٰمٓ السجدۃ۔ ۴۰)

"جو جی چاہے کرو وہ تمہارا سب کیا ہوا دیکھ رہا ہے۔"

وہ ان کے ماضی اور مستقبل سے بھی آگاہ ہے۔

"وہ تم کو (اور تمہارے احوال کو اس وقت سے) خوب جانتا ہے جب تم کو زمین سے پیدا کیا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے" (النجم۔۳۲)

خالق کا اپنے بندوں کے ساتھ ایسا قرب اور معیت اور اسقدر نگہبانی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اس کو اپنے بندوں سے بہت پیار ہے اور کیوں نہ ہو ــــ کہ انسان اللہ تعالےٰ کا حسین شاہکار ہے۔ جیسا کہ سورۃ التین میں ارشاد فرمایا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝

"بے شک ہم نے انسان کو بہترین صورت پر بنایا۔"

کوئی معمولی مصور بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے شاہکار کو آلودہ کرے تو پھر احسن الخالقین یہ کیسے پسند فرما سکتا ہے کہ اس کے حسین ترین شاہکار (انسان) کو کوئی داغدار کر دے یا نیک راہ سے ہٹا دے اور بدی کے راستہ پر ڈال دے یا روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں گمراہ کر دے۔ لہذا اس نے اپنے آپ کو ہمارے حال سے باخبر رکھا اور ہماری ہدایت کا مکمل اور جامع بندوبست فرمایا۔ اس بزرگ و برتر ہستی کا اس تمام کائنات پر کتنا عظیم کنڑول ہے کہ اس کے حیطۂ اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں۔ ہر شے پر اس کی حاکمیت ہے۔ یہی اللہ تعالےٰ، اور اس کی صفات پر پختہ یقین، وہ بنیاد ہے جس پر انسانی فلاح و نجات کا محل تیار ہوتا ہے اور عمل صالح اس کا چونا اور گارا ہے۔ نیک اعمال کے بغیر اللہ تعالےٰ پر ایمان کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

اللہ تعالےٰ کی ان صفات، کی وضاحت حضرت حاتم اصم رضی اللہ عنہ نے

اس طرح فرمائی کہ :

" تین حالتوں میں خبردار رہو۔ جب کام کرو تو یاد رکھو کہ خدا دیکھتا ہے
" جب بات کرو تو یاد رکھو کہ خدا سنتا ہے اور جب خاموش رہو تو یاد
رکھو کہ وہ (اللہ) جانتا ہے کہ کیوں چپ ہو "

ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ عقیدہ کامل ہو جائے تو ایسا شخص کوئی برا عمل کرنے کی جرأت کیسے کرے گا وہ تو زبان سے بھی کوئی بری بات نہیں نکلے گا جو فتنہ و فساد کا موجب بنے اور نہ ہی دل میں کوئی ایسا شیطانی وسوسہ لائے گا جس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کے روبرو شرمندگی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی رح نے کیا خوب فرمایا، کہ :

" پولیس اور فوج تو انسانوں کی ظاہری برائیوں ہی پر نگاہ رکھ سکتی ہے
اسی طرح قانون تعزیرات صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمع
میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے لیکن دعوتِ اسلام کے فیض اثر نے
دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا ہے
اور مقفل دروازوں کی کھڑکیوں سے بھی جھانکتا ہے "۔ (سیرت النبیؐ)

اگر ایسے خدا کی نگہبانی پر یقین ہو تو پھر اس سے چھپ کر کوئی کس جگہ برائی کر سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی دیگر صفات کا علم بھی انسان کو راہِ راست پر رکھنے میں بہت معاون و مددگار ہے

انسان شیر، سانپ اور آگ سے اس لئے ڈرتا ہے کہ اس کو اُن کی صفات کا علم ہے کہ اگر مناسب احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو اُن سے کسی بھی وقت نقصان کا احتمال ہے۔ اسی طرح انسان کو اگر اللہ تعالےٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا علم نہ ہو اور وہ دنیا میں اپنی زندگی لاپرواہی

سے گذارے تو ظاہر ہے کہ اس کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے کسی عذاب میں پکڑے جانے کا کسی بھی وقت امکان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :

"کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالےٰ نے آسمانوں اور زمین کو کسی مصلحت سے پیدا کیا ہے۔ وہ اگر چاہے تو تمہیں ناپید کر دے اور ایک نئی مخلوق لا بسائے اور یہ بات اللہ پر کچھ دشوار نہیں" (سورۃ ابراہیم ۱۹)

ایک اور جگہ فرمایا :

"اور اگر ہم چاہیں تو جہاں وہ ہیں وہیں ان کی صورتیں بدل دیں پھر وہ آگے چل سکیں اور نہ پیچھے لوٹ سکیں" (سورہ یٰس : ۶۷)

وہ تمام قوت کا سرچشمہ اور زبردست سطوت و جبروت کا مالک ہے اس کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔

"اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس تکلیف کا سوائے اس کے اور کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرے تو کوئی اس کے فضل کا ہٹانے والا نہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہے پہنچائے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے" (سورۂ یونس : ۱۰۷)

اور ہر شخص براہِ راست اللہ تعالےٰ کے قابو میں ہے، ارشاد فرمایا :

"کوئی شخص زمین پر چلنے والا ایسا نہیں جس کی چوٹی وہ پکڑے ہوئے نہ ہو" (سورۂ ھود : ۵۶)

اور آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں - فرمایا :

"آسمان اور زمین کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں" (شوریٰ : ۱۲)

اور وہی ہر ایک کو روزی دینے والا ہے، فرمایا :

"اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی روزی اپنے ساتھ نہیں اٹھائے پھرتے

اللہ انھیں روزی دیتا ہے اور تمھیں بھی۔" (سورۂ العنکبوت: ۶۰)

اللہ جل شانہ کی عظمت وجلال کا یہ عالم ہے کہ اس کی ہر مخلوق حتیٰ کہ پہاڑ جیسی سخت چیز بھی اس کی ہیبت سے ریزہ ریزہ ہو جائے۔ قرآنِ پاک میں ہے کہ:

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور آپ دیکھتے جھکا ہوا پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے"۔ (سورۂ الحشر۔ آیۃ ۱۷)

ایک اور جگہ فرمایا:

"اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں"۔ (البقرہ ۔ ۷۴)

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

"خوف (خدا) کے ثمرات ہیں عفت۔ تقویٰ اور زہد ہے اور یہی سعادتِ ابدی کی بنیاد ہے کیونکہ خواہشات نفسانی سے پرہیز کا نام عفت ہے، حرام سے پرہیز کا نام زہد ہے اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرنے کو تقویٰ کہتے ہیں"

لہٰذا جب خداوند عالم کے جبار اور قہار ہونے کا یقین ہو گا اور یہ پہچان لیں گے کہ ہم خود کتنے ناقص ہیں اور وہ کتنا کامل ہے تو ناممکن ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ سے خوف نہ کرنے لگے۔ یہ بھی حضور ہی کا ارشاد ہے کہ خدا سے ڈرنے والے سے دُنیا والے خوف کھاتے ہیں۔ اور جو آدمی خدا سے نہیں ڈرتا اس کو دنیا کی تمام چیزیں ڈراتی ہیں۔ بہرحال خوفِ خدا کا مقصد برائیوں سے پرہیز کرنا ہے جیسا کہ آنحضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک دعا میں ہے:

"اے اللہ! ہم آپ سے خوف اس قدر مانگتے ہیں کہ اس سے آپ ہم میں اور معصیت میں حائل ہو جائیں"۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ پر یقین کامل اور اس کی ان گنت صفات کے علم کی بدولت ہی انسان جلوت ہی میں نہیں خلوت میں بھی برائیوں سے بچنے کی کوشش کریگا اور اپنے باطن (یعنی دل) کو بھی ناپاک جذبات اور پراگندہ خیالات سے پاکیزہ رکھنے کیطرف راغب ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدے کی کمزوری انسان کو اپنے خالق و مالک کا باغی بنا دیگا اور باغی کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ پر توکل

اس عقیدہ کا ایک اور تابناک اور حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد بھی حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ اس سے بہتر کوئی کارساز نہیں۔ اہلِ دنیا وہیں تک ساتھ دے سکتے ہیں جہاں تک اُنکے مفادات محفوظ رہیں اس لئے جو لوگ سہاروں پر تکیہ کرتے ہیں، ان سے بڑا مشرک کوئی نہیں۔ توحید کا مفہوم سمجھ میں آجائے تو سہاروں کی حاجت نہیں رہتی۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ خدا کو قادر اور قیوم جاننے کے بعد انسان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ وہ ذات سہاروں کے بغیر بھی نوازنے پر قادر ہے اور سہاروں کی موجودگی میں بھی محروم کر سکتی ہے ؎

کس کا دریا، کس کا طوفاں، کیسی کشتی، کیسی موج
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے!

قرآن حکیم میں ہے:

"کیا تم کو یہ ڈر نہیں کہ وہ (اگر چاہے) خشکی کا کنارہ تم پر دھنسا دے

یا آندھی کا پتھراؤ کرے پھر بچانے والا کسی کو تم نہ پاؤ" (بنی اسرائیل: ۶۸)

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں، سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔ تو ڈبو دینے والی موج ہی زندگی کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

"اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالےٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر توکل کرے گا اللہ تعالےٰ اس (کی اصلاح و مہمات) کے لئے کافی ہے" (الطلاق: ۲، ۳)

جب ایمان کامل اور طلب صادق ہو تو خدا کی رحمتیں خود بندے کی تلاش میں سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔ ایسے انسانوں کے لئے قدرت اپنے قوانین بدل ڈالتی ہے۔ یہ رحمتیں کبھی سرور کونین صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاء بن کر بدر و حنین کی جنگوں میں فرشتوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں اور کبھی حضرت ہاجرہ کے سینے کے سوز کے بہانے معصوم بچے (یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام) کے قدموں میں پانی کا چشمہ بن کر ایک عالم کو سیراب کر ڈالتی ہیں۔ لیکن انسان اگر اپنی طلب کے زاویے ہی درست نہ کرے تو مشیت اس کے ارادوں کی پابند نہیں ہو سکتی۔ خدا کی رحمت مطلوب ہو تو عتاب کے مقامات اور اعمال بد سے اجتناب کرنا ہی پڑے گا۔

حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ نے فرمایا کہ:

"روپیہ پیسہ اس لئے ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کمائے مگر تو نے اسے بت بنا لیا ہے اپنے سب کام اللہ کے سپرد کر دے۔ وہ تمہاری مصلحت تم سے زیادہ جانتا ہے۔"

آخرت پر یقین

اب سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالےٰ کی ہدایات کے مطابق یا اس کے خلاف زندگی گذارنے پر ہی بات ختم ہو جاتی ہے۔ کیا نیک سیرت اور بد کردار۔ مطیع اور باغی انسانوں کا انجام ایک ہی جیسا ہوگا؟ بظاہر یہ بات عدل و انصاف اور عقل سلیم دونوں کے خلاف ہے۔

اگر ایسا ہو تو پھر کسی کو فسق و فجور، ظلم و ستم۔ لوٹ کھسوٹ اور غارتگری سے کون باز رکھ سکے گا۔ پھر تو ہر شخص چنگیز اور ہلاکو بن جائے گا اور وہ تباہی مچ جائے گی کہ تہذیب و تمدن کا جنازہ ہی نکل جائے گا۔

"اور وہ جب حاکم بن جاتا ہے تو سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے اور تباہ کر دے کھیتیوں کو اور نسل انسانی کو"۔ (البقرہ: ۲۰۵)

اور وہ اپنے اقتدار کے نشے میں کسی کی ہدایت پر کان نہیں دھرتا:

"اور جب اُسے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو اور اکساتا ہے اسے اُسکا غرور گناہ پر" (البقرہ: ۲۰۶)

لہذا انسانیت کی بقا کے لئے یہ لازم ہے کہ اچھے اور بُرے اعمال کا حساب لینے کا کوئی وقت بھی مقرر کیا جائے اور سزا و جزا کا کوئی خدائی قانون بھی نافذ کیا جائے تاکہ اطاعت شعاروں کو انعام اور سرکشوں کو سزا دی جا سکے، ورنہ اعمال کی درستگی کی فکر کسی کو کیسے لاحق ہوگی؟ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے جو بڑی ہی حکمت والے ہیں، اپنے بندوں کی حفاظت اور نگہبانی کا ایک نہایت جامع نظام قائم فرما دیا۔ اسے عقیدۂ آخرت کہتے ہیں۔ اس میں یہ امور شامل ہیں

۱۔ یہ یقین کہ قیامت ضرور آئے گی۔

۲- یہ یقین کہ ایک مرتبہ مرنے کے بعد ہر انسان کو دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ یعنی اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے اور وہی حقیقی اور دائمی ہے۔

۳- یہ یقین کہ اس دنیا میں انسان نے جو اعمال کیے ہیں، اچھے یا بُرے ہر شخص سے ان کی باز پرس کی جائے گی، کوئی بھی اس احتساب سے نہ بچ سکے گا۔

۴- یہ یقین کہ ہر شخص کا عمل ہر وقت لکھا جا رہا ہے جس کی مکمل فہرست (یعنی اعمالنامہ) قیامت کے دن اس کے حوالے کر دی جائے گی۔

۵- یہ یقین کہ اللہ تعالےٰ ہر شخص کے ساتھ قیامت کے دن عدل و انصاف فرمائیں گے۔ مکمل شہادت پیش کی جائے گی۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا پوری طرح خود ہی جواب دہ ہوگا۔ نیک اعمال کا پورا اجر اور بُرے اعمال کی پوری سزا ہر شخص کو ملے گی لیکن کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا

اب ہم اس نظام کے مختلف پہلوؤں پر مختصراً کچھ روشنی ڈالیں گے، تاکہ اس عقیدہ کی اہمیت، افادیت اور جامعیت پوری طرح واضح ہو سکے

۱- قیامت ضرور آئے گی!

قیامت کا وقت مقرر ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ البتہ وہ اچانک آجائے گی۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی نشان دہی فرمائی گئی ہے چنانچہ فرمایا:

"اے پیغمبرؐ! آپ کیا جانیں، شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔ جن لوگوں کو قیامت کا یقین نہیں وہ اس کی جلدی مچاتے ہیں اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ قیامت سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کا

آنا برحق ہے۔ سن لیجئے جو لوگ قیامت میں شک کرتے ہیں وہ پرلے
درجے کے گمراہ ہیں۔" (سورۃ الشوریٰ : ۱۷)

ایک اور جگہ فرمایا :

وہ آگ (قیامت) ان پر ایک دم سے آموجود ہوگی۔ پھر اُن کو ہکا بکا
کر دے گی۔ نہ اس کو ہٹا سکیں گے نہ مہلت ہی مل سکے گی۔"
(سورہ الانبیاء — ۹۷)

قیامت ہولناک چیز ہے۔ ارشاد فرمایا : " جس دن آسمان پگھلے تانبے
کی طرح ہوجائے گا اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح (اُڑتے پھریں گے)
کوئی رشتہ والا اپنے رشتہ دار کو دکھائے جانے پر بھی نہ پوچھے گا (المعارج ۸ تا ۱۱)

ایک جگہ ارشاد ہوا : " زمین اور پہاڑ دونوں کو اٹھا کر ٹکرا دیا جائے گا۔
اس دن ہو پڑنے والی قیامت ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جائیگا۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا : " اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا زلزلہ
بڑی (خوفناک) چیز ہے۔ جس دن تم اُسے دیکھو گے، اس دن دودھ
پلانے والی ماں اپنے دودھ پلاتے پیارے بچے کو بھول جائے گی اور
حمل والیوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے۔ اور تم دیکھو گے ۔ سب
لوگ نشہ کی سی حالت میں ہیں۔ درحقیقت وہ نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ
اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ اس کی دہشت سے لوگ بے ہوش ہو
جائیں گے۔" (سورۃ الحج — ۱ تا ۲)

قیامت سے صرف متکبر لوگ ہی انکار کرتے ہیں :

" پھر جو آخرت کو نہیں مانتے ان کے دلوں میں انکار بس گیا ہے
اور وہ متکبر ہیں۔" (النحل — ۲۲)

اب تو دورِ جدید کے سائنسدان بھی اس کے قائل ہوتے جا رہے ہیں کہ قیامت برحق ہے۔ برطانیہ کے دو ماہروں نے طویل تحقیقات کے بعد اپنی مشترکہ تصنیف "زمین کو جھٹکا" میں پیش گوئی کی ہے کہ مستقبل قریب میں کرۂ ارض کی سطح پر اور خلاء میں ایسی تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں جس سے کروڑوں انسان ہلاک ہو جائیں گے۔ ان تبدیلیوں کی وضاحت کرتے ہوئے امپیریل کالج لندن کے ڈاکٹر بوبھ اور برنزوک کالج کے پروفیسر فرینک پچ لکھتے ہیں کہ بعض علاقوں میں شہاب ثاقب گریں گے اور فضا سے آگ برسے گی۔ چٹانیں گرمی کی شدت سے پگھل جائیں گی جس سے شمالی امریکہ کی ایک تہائی آبادی فوری طور پر ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد دوسرے براعظم زلزلوں کی لپیٹ میں آ جائیں گے جس سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور سمندری لہریں وسیع علاقوں میں تباہی مچا دیں گے۔

(نوائے وقت: ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء)

لہٰذا نجات کا ایک ہی طریقہ ہے کہ:

"تم اپنے رب کا حکم مان لو قبل اس کے کہ ایسا دن آ پہنچے جس کے لئے خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا نہ تم کو اس روز کوئی پناہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا رہی ہے"۔ (الشوریٰ — ۴۷)

سورۃ الانبیاء میں ہے:

"لوگوں کے حساب کا وقت نزدیک آ گیا اور وہ (ابھی تک) غفلت میں پڑے ہیں منہ پھیرے ہوئے"۔ (آیت: ۱)

ایک حدیث میں ہے کہ "جب دو تہائی رات گذر جاتی تو رحمت للعالمین

صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضؓ سے فرماتے :

" لوگو! اللہ کو یاد کرلو، عنقریب قیامت کا زلزلہ، پھر صور پھونکنے کا وقت آرہا ہے اور (ہر شخص کو) موت اپنی ساری سختیوں سمیت آ رہی ہے "

۲- حیات بعد الموت :

قیامت کے بعد اللہ تعالےٰ جب چاہیں گے سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کریں گے - پھر ہر انسان کا پوری زندگی کا حساب لیا جائے گا - سورہ الکھف میں ارشاد فرمایا :

" اور پھر ہم سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کریں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے اور وہ سب قطار در قطار اپنے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے " (الکہف : آیۃ ۴۷)

اور یہی حقیقی زندگی ہوگی جس کی راحتیں یا تکالیف کبھی ختم نہ ہوں گی - ارشاد فرمایا

" مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لئے اللہ نے ان (جنت کے) باغوں کا وعدہ فرمایا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں - وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے (سورہ التوبۃ ۷۲)

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا : " اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں (ہدایات) جھٹلائیں گے، وہ دوزخ والے ہیں - ان کو ہمیشہ اُس میں رہنا ہے " (البقرہ - ۲۱ تا ۲۹)

۳- احتساب سے کوئی نہ بچ سکے گا :

کوئی شخص احتساب سے بچ نہیں سکے گا - ارشاد فرمایا :

"اس دن تم سب خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے۔ تم میں سے کوئی چھپنے والا چھپ نہیں سکے گا۔" (سورہ الحاقہ)

اس دن پیغمبروں کو بھی جواب دہ ہونا پڑے گا — ارشاد فرمایا:

"تو ہم بے شک جن کے پاس پیغمبر آچکے ان سے باز پرس کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔" (الاعراف : ۱۲)

اور پیغمبر جواب میں عرض کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے تو آپ کے احکامات اور ہدایات بندوں تک پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اُس دن مجرمان تو اپنے چہروں ہی سے پہچان لئے جائیں گے۔ ارشاد فرمایا

"جس دن نکل پڑیں گے قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے نشانوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں (شرمندگی کے مارے) ذلت اور خواری اُن پر چھا رہی ہو گی۔ بس یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔" (سورۃ المعارج — ۴۳، ۴۴)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن آدم کے بیٹے (یعنی انسان کے) قدم اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے متعلق جواب طلب نہ کر لیا جائیگا

اوّل : عمر کن باتوں میں ضائع کی ؟

دوم : جوانی کن باتوں میں گنوائی ؟

سوم : مال کیسے کمایا ؟

چہارم : یہ مال کن کاموں میں صرف کیا ؟

پنجم : علم سیکھ کر اس پر عمل کیا اور کتنا کیا ؟ (مشکوٰۃ شریف)

۴۔ انسان کا ہر عمل لکھا جارہا ہے!

انسان کی ایک سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھے بیٹھا ہے کہ جو اعمالِ بد وہ چھپ چھپ کر اور خفیہ طور پر کرتا ہے، اس کا کسی کو پتہ نہیں لگتا۔ یہ درست ہے کہ ایسے مجرم، پولیس اور لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر تو جرائم کر سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالےٰ جو ہمارے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اس کی نظروں سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ جہاں کوئی آنکھ دیکھنے والی نہیں وہاں اللہ تعالےٰ خود اس کا گواہ بن جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ہر عمل کا ریکارڈ مرتب کرنے کا اس قدر مکمل اور خودکار طریقہ نافذ فرمادیا ہے کہ کسی انسان کی ذرہ بھر نیکی یا ذرہ بھر برائی ایسی نہیں جو اس کے اعمالنامہ میں درج ہونے سے رہ جائے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

"اور نامۂ اعمال (ہر انسان کے ہاتھ میں) رکھا جائے گا تو تم مجرموں کو دیکھو گے کہ اس کے لکھے ہوئے سے ڈرتے ہوں گے اور کہیں گے ہائے خرابی ہماری اس نوشتہ کو کیا ہوا۔ نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا جسے گھیر نہ لیا ہو، اور اپنا سب (کچھ) کیا انھوں نے سامنے پایا" (الکہف ۴۹)

ایک اور جگہ فرمایا:

"یہ ہماری نوشتہ (کتاب) تم کو حق (بات) بتلاتی ہے۔ ہم لکھتے رہے تھے جو تم نے کیا" (الجاثیہ ۲۷تا۲۹)

ایک اور جگہ واضح فرمایا کہ ہر شخص کی گردن سے ایک کتاب چپکا رکھی ہے جس میں خود بخود سب کچھ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کی ٹیپ ریکارڈر ہے۔ ارشاد فرمایا:

"اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے اور (پھر) قیامت کے دن ہم اس کی یہ کتاب (نامۂ اعمال، اس کے واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا، اپنی کتاب (اعمال نامہ خود ہی) پڑھ لے۔ آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے"۔ (بنی اسرائیل: ۱۳، ۱۴)

۵۔ جزا و سزا

جزا و سزا کا تصور، عقیدہ آخرت کی روح ہے۔ اگر نیکیوں پر فلاح کی اُمید اور بدکاریوں پر سزا کا خوف نہ ہو تو پھر کوئی کسی برائی سے کیوں اجتناب کرے گا۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ:

"یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی تو نہ اُن پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے"۔ (البقرہ: ۸۶)

اور نیک سیرت انسانوں کو یہ بشارت دی گئی۔ فرمایا:

"جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے"۔

اور جو اللہ تعالےٰ کی آیتیں جھٹلانے والے ہوں گے ان کے متعلق حکم فرمایا:

"اور وہ جو کفر کریں گے اور میری آیتیں (ہدایات) جھٹلائیں گے، وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اُس میں رہنا ہے"۔ (البقرہ ۔ ۲۱ تا ۲۹)

بقول حضرت امام غزالیؒ انسان پر عذاب کسی دوسری جگہ سے کوئی چیز نہیں بلکہ اسی کی آگ ہے جس میں جلے گا۔ تمہارے اعمال ہی تمہاری دوزخ ہیں جو تمہاری طرف بڑھتے ہیں جس طرح مقناطیس اپنی ہم جنس کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس طرح دوزخ خود، دوزخ والے اعمال کرنے والے کو کھینچتی ہے

۶ - اچھے اور برُے اعمال کے متعلق گواہ کون ہوگا؟

دنیا کی عام عدالتوں کا یہ مسلمہ قانون ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک اس کے خلاف عائد کردہ الزام کو معتبر گواہ ثابت نہ کر دیں۔ عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں نہ تو اللہ تعالےٰ کی کچہری نظر آ رہی ہے نہ اللہ تعالےٰ کی پولیس ہی ہمیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ پھر کیا اللہ تعالےٰ انسانوں کو بغیر کسی گواہی کے مورد الزام ٹھہرا کر حکم سزا سنا دیں گے؟ اللہ تعالےٰ رحیم و کریم ذات سے بھلا یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کی بارگاہ میں جب انسان دوبارہ زندگی ملنے پر پیش کئے جائیں گے تو عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے — نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ہر شخص کے متعلق مختلف قسم کی تحریری اور تقریری شہادتیں پیش کی جائیں گی اور انسان ان کو سنکر ہکا بکا رہ جائے گا کہ اتنی معتبر اور ناقابل تردید شہادت کیسے فراہم کر لی گئی۔

سب سے اولین شہادت تو خود خالق کائنات کی ہوگی چنانچہ ارشاد فرمایا

"البتہ ہم ان پر (قیامت کے دن اپنے) علم سے (ان کے اعمال) بیان کریں گے اور (ان کے کرتے وقت) ہم کہیں غائب نہیں تھے"

"یہ ہماری نوشتہ (کتاب) تم کو حق (بات) بتلاتی ہے ہم لکھتے رہے تھے جو تم نے کیا" (الجاثیۃ — ۲۷-۲۹)

ایک شاعر نے اس کے علم کے متعلق کیا خوب کہا ہے:

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیوں ہوا کیونکر ہوا

۲- دوسری قسم کی شہادت اللہ تعالےٰ کے ان فرشتوں کی ہوگی جو ہر انسان کی اچھے اور بُرے اعمال کی فہرستیں (یعنی اعمالنامہ) تیار کرنے پر مقرر کر دیئے گئے ہیں، ارشاد ربانی ہے :

"کوئی نہیں بلکہ تم انصاف کرنے کو جھٹلاتے ہو اور بے شک تم پر کچھ نگہبان ہیں معزز لکھنے والے (کرامًا کاتبین)، فرشتے جو جانتے ہیں جو کچھ تم کرو"۔ (سورہ الانفطار — آیۃ ۹ تا ۱۱)

"وہ کتاب ایک مہر کیا نوشتہ ہے (جو نہ مٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے)، کہ مقرب جس کی زیارت کریں" (سورۃ المطففین: آیۃ ۲۰، ۲۱)

۳- تیسری قسم کی گواہی انسان کے اپنے اعضا دیں گے :

"اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف ہانکے جائیں گے تو ان کے اگلوں کو روکیں گے یہاں تک کہ پچھلے آملیں - یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے سب ان پر ان کے کئے (اعمال)، کی گواہی دیں گے اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہم پر کیوں گواہی دی - وہ کہیں گی - ہمیں اللہ نے بولنے کا حکم دیا جس نے ہر چیز کو گویائی بخشی (دنیا میں)، اور اس نے تمہیں پہلی بار بنایا اور اسی کی طرف پھرنا ہے اور تم اس سے کہاں چھپ کر جاتے کہ تم پر گواہی دیں تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں لیکن تم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اللہ تمہارے بہت سے کام (اعمال)، نہیں جانتا -" (حٰمٓ السجدہ — آیۃ ۱۹ تا ۲۲)

گویا انسان کی کھال پر ان کے اعمال ہر وقت اس طرح نقش ہو رہے ہیں جیسے آج کل تقریر ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر لی جاتی ہے - یہ تقریر دوبارہ

پھر جب چاہے سُنی جاسکتی ہے کہ اس نے کیا کہا تھا۔

۴۔ چوتھی قسم کی شہادت زمین کے اس ٹکڑے کی ہوگی جس جگہ انسان نے کوئی اچھا یا بُرا عمل کیا ہوگا۔ ایک حدیث شریف میں فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی:—
یومئذ تحدث اخبارھا (قیامت کے دن زمین اپنی سب خبریں بیان کرے گی)، پھر آپ نے فرمایا۔ تم جھے اس کا کیا مطلب ہے؟
صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ ہی زیادہ جاننے والے ہیں
آپؐ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن زمین اللہ کے ہر بندہ پر اور ہر بندی پر گواہی دے گی ان اعمال کی جو انہوں نے زمین پر کئے ہوں گے۔ یعنی اللہ کے حکم سے زمین اس دن بولے گی اور بتلائے گی کہ فلاں بندہ نے یا فلاں بندی نے فلاں دن میرے اوپر یہ عمل کیا تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

آپؐ نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ قیامت کے دن بندہ سے فرمائے گا: آج تو خود ہی اپنے اوپر گواہ ہے اور میرے لکھنے والے فرشتے بھی موجود ہیں اور بس یہی گواہیاں کافی ہیں۔ پھر ایسا ہوگا کہ اللہ کے حکم سے بندہ کے مُنہ پر مُہر لگ جائے گی، وہ زبان سے کچھ نہ بول سکے گا اور اس کے دوسرے اعضاء (ہاتھ پاؤں وغیرہ) کو حکم ہوگا کہ تم بولو: پھر وہ اس کے اعمال کی ساری سرگذشت سنائیں گے

۵۔ پانچویں قسم کی شہادت وہ مظلوم لوگ ہوں گے جن کو ناحق ستایا گیا ہوگا یا جن کا کوئی جائز حق ادا نہ کیا گیا وہ بارگاہ الٰہی میں فریاد کریں گے کہ اے اللہ اس

شخص نے ہم پر بڑا ظلم کیا تو اس سے آج ہمارا بدلہ لے۔

۶۔ چھٹی قسم کے گواہ ہر اُمت کی طرف بھیجے جانے والے رسول ہوں گے۔ جو یہ تصدیق کریں گے کہ انھوں نے اللہ تعالےٰ کے احکام پورے پورے بندوں تک پہنچا دیئے تھے۔ لیکن وہ باوجود بار بار نصیحت کئے جانے کے ان ہدایات کو جھٹلاتے رہے۔

۷۔ ساتویں قسم کی شہادت کی نوعیت ان سب سے مختلف ہوگی۔ روز قیامت اللہ تعالےٰ ہمارے نیک اور بد اعمال کا سائنٹیفک تجزیہ بھی فرمائیں گے۔ ان کو "المیزان" کے آلے سے پرکھا اور جانچا جائے گا۔ جس طرح دنیا میں ہم کسی بدن کا وزن مشین سے کر لیتے ہیں یا حرارت، اور بلڈ پریشر کی پیمائش تھرمامیٹر اور دوسرے طبی آلات سے کر لیتے ہیں۔ یہ میزان بھی ایک قسم کا بیرومیٹر یا مشین ہوگی جس سے نیک یا بد اعمال کی مقدار فوراً معلوم ہو جائے گی۔ ارشاد فرمایا:

"ہم قیامت کے دن انصاف کی میزان لگائیں گے اور کسی کے ساتھ وہاں کوئی ناانصافی نہ ہوگی اور اگر کسی کا کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو ہم اس کو حاضر کریں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔" (سورۃ الانبیاء - ۴۷)

غرضیکہ ان مندرجہ بالا اصولوں سے یہ بخوبی واضح ہے کہ یہ عقیدۂ آخرت ہی ہے جو بقول علامہ اقبال " انسانی کارکردگی اور انسانی فضائل کو متوازن رکھتا ہے، اور مائل بہ عمل بھی۔" ۵

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود
ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود

عقیدۂ آخرت کے بغیر کوئی نیکی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی عقیدہ انسانوں کے عمل کی حدود متعین کرتا ہے۔ ورنہ شریعت کا اتباع ناممکن ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو پسِ پشت ڈال کر بداعمالیوں پر دلیر ہونے پر تعزیر کا خوف نہ ہو تو معاشرتی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے بغیر صراط مستقیم کی طرف راغب ہونا ممکن نہیں۔ اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ جنت کا سارا عیش و آرام تمہارے لئے مقدر ہو چکا ہے تو پھر کوئی انسان اچھا کام کرنے کی فکر کیوں کرے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب ایک عورت نے سوال کیا کہ کیا اللہ اپنے بندوں پر ماں کے بچہ سے زیادہ مہربان نہیں؟ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ "ہاں"۔ تو (وہ عورت) بولی کہ ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی۔ اس پر رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے سر جھکا لیا۔ بہت روئے۔ پھر سرِ مبارک اس کی طرف اٹھا کر فرمایا کہ: اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں صرف سرکش متکبر ہی کو عذاب دے گا۔ جو اللہ تعالےٰ پر سرکشی کرے اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے انکاری ہو۔" (مشکوٰۃ شریف)

فرمانِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالےٰ کا یہ قہر اور عذاب کا خوف دلانا در اصل اپنے بندوں پر رحمت اور ان کی حفاظت، اور نگہبانی ہی کا ایک طریقہ ہے تاکہ وہ دوزخ والے اعمال کی راہ اختیار ہی نہ کریں۔ فکرِ حیات پر، آخرت کی فکر مسلط کر کے، دنیوی اور اخروی زندگی میں ایک حسین تناسب قائم کر دیا گیا ہے۔ اور اگر انسان اپنے اعمال اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق سرانجام دیں تاکہ اس کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو دنیوی زندگی بھی سارا دین ہی بن جاتی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام بھی اس فکرِ آخرت سے غافل نہ تھے۔ اُن کی

اس صفت کا قرآن کریم میں خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا

"اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ۔ اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کیجئے جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔ ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ یادِ آخرت کی ہے۔" (ص۔ ۴۶)

تو جب انبیاء ذکرِ آخرت سے خالی نہیں تو عوام الناس کس گنتی و شمار میں ہیں۔ اگر اس عقیدۂ آخرت کی پشت پر ایک زبردست قوت نافذہ نہ ہو، کوئی اتھارٹی نہ ہو تو محض زبانی ہدایات بے معنیٰ ہو کر رہ جائیں ـــــ بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی "عقیدۂ آخرت کے یقین سے ایسا محسوس ہوگا کہ ہر وقت ایک نگران لگا ہوا ہے جو برائی کے ہر ارادے پر اسے ٹوکتا۔ ہر اقدام سے اسے روکتا اور ہر عمل پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ ایک سخت گیر محتسب ہر وقت اسکے اندر بیٹھا ہے۔ اس لئے وہ سنسان جنگل یا اندھیرے میں بھی خدا کے مقرر کردہ فرض سے فرار یا حرام کا ارتکاب نہیں کرے گا اس سے بڑھ کر اخلاقی اصلاح، اور انسان کے اندر ایک مستحکم کردار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

اس عقیدۂ آخرت کا نفسیاتی پہلو بھی بہت اہم ہے کیونکہ انسان جزا سے فطری طور پر خوش ہوتا ہے اور برائی سے رُک جاتا ہے۔ اگر مرنے کے بعد کی زندگی میں قربانی اور ایثار کا کوئی پُرکشش اور قابلِ قدر انعام نہ ہو تو انسان میں صفتِ ایثار و قربانی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ نہ کسی مصیبت یا آزمائش پر صبر کریگا اور نہ اس میں اچھائی کی تحریک ہی پیدا ہوگی۔ تمام اخلاقی خوبیاں آخرت کے عقیدے سے مربوط ہیں اگر آخرت کے عقیدہ کو نظر انداز کر کے اصلاحِ معاشرہ کا کوئی پروگرام بنایا جائے گا تو اس کا نتیجہ بربادی، جہنم اور آگ کے سوا کچھ برآمد نہ ہوگا۔

۳۔ پیغمبروں پر یقین

یہ عقیدہ وہ اہم درمیانی کڑی ہے جو عقیدۂ توحید کو عقیدہ آخرت سے ملاتی ہے۔ خدا کی طرف سے انسان کو خاص علم و ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف انبیاء کے ذریعہ ہی دی جاتی ہے اور یہ علم انھیں بالعموم بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ اگر یہ علم خاص انبیاء کو نہ دیا جائے تو عام لوگ اللہ تعالےٰ کے پیغام لانے والے کی شناخت نہ کر سکیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخرالزماں ہیں۔ اس لیئے ان کو اللہ تعالےٰ نے تمام دنیا کے لئے اور ہر آنے والے زمانے کے لیئے رسالت عطا فرمائی اور آپؐ کے وسیلہ سے اپنی آخری کتاب ہدایت (یعنی قرآنِ کریم) عطا فرمائی جو تاقیامت انسانوں کیلئے ہدایت وحکمت کا خزانہ ہے۔

نبی صرف نظام عبادات ہی لے کر نہیں بھیجا جاتا بلکہ وہ تو ایک پورا نظامِ زندگی لے کر آتا ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں "دین" کہتے ہیں۔ وہ اس دین کو صرف لوگوں تک پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ ان ہدایات کے مطابق خدا اور انسان کے درمیان عملاً کیسا تعلق ہونا چاہیئے۔ انبیاء علیہم السلام اس منزل کی اطلاع دیتے ہیں جہاں زندگی کی آخری آرام گاہ ہے۔ وہ منزل کا سراغ بھی دیتے ہیں اور وہاں کے احوال و کوائف بھی بتاتے ہیں تاکہ انسان وہ سرمایہ فراہم کرے جو وہاں کام آتا ہے۔

چونکہ عمل صالح، ایک مستقل اور پیہم عمل کی حالت کا نام ہے اس لئے علم کے ساتھ نمونہ کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ اچھے اور برُے اعمال کا بیان تو قرآن پاک میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے لیکن ان کے مطابق اعمالِ حسنہ

کا عملی نمونہ بھی موجود ہو تو ہدایت پر عمل کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ پھر غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ آنحضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے اور بہترین نمونہ ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہترین کتاب، اللہ کی کتاب (یعنی قرآن) ہے اور راہوں میں بہترین راہ محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ہے اور بدترین چیزیں وہ ہیں جو نئی نکلی ہیں اور جو بدعت ہے۔ گمراہی ہے۔"

ایک اور حدیث میں جسے حضرت مالک بن انس رضؓ نے روایت کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے (وہ چیزیں یہ ہیں) اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت" (مشکوٰۃ شریف)

سنت سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال کی پیروی کرنا۔ یعنی آپؐ کے وہ اعمال اور اقوال جو دیکھنے والوں نے بیان کئے۔ ان میں وہ کام بھی شامل ہیں جو آپؐ کے سامنے دوسروں نے کئے اور آپ نے انھیں پسند فرمایا یا منع نہ فرمایا۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کی طرزِ زندگی اور آپ کا طریق معاشرت نہایت پسند فرمایا۔ آپ کے اخلاق کو "خُلقِ عظیم" فرمایا۔ اور تمام اہلِ ایمان کو حکم فرمایا کہ آپؐ ہی کے اسوۂ حسنہ پر عمل کریں۔

معلوم ہوا کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عادات و اخلاق اور خصائل اپنے اندر پیدا کرنا ہی دراصل آپؐ کی سنت ہے اور یہ مقامِ شکر اور باعثِ اطمینان ہے کہ محسن انسانیت صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تمام احکام، اللہ کے نیک بندوں نے بڑے محققانہ طور پر محفوظ کر لئے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے میری سنت کو پسند کیا، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا" (مشکوٰۃ شریف)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لئے "انسان کامل" (یعنی آئیڈیل) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اکمل ترین شخصیت ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے آپؐ کی اطاعت اور پیروی کو خود اپنی اطاعت قرار دیا۔ ارشاد فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء: ۸۰)

"جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے بلاشبہ اللہ کی اطاعت کی"

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ:

"تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ ایمان دار نہیں جب تک وہ آپس کے تنازعات میں آپ کو اپنا حَکَم نہ بنائیں۔ پھر آپؐ جو فیصلہ دیں اس کے بارہ میں اپنے اندر کوئی تنگی نہ پائیں اور اسے خوشی سے مانیں"۔ (النساء: ۶۵)

غزوۂ اُحد کے موقع پر عتبہ بن ابی وقاص نے پتھر مار کر جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید کر دیا اور چہرہ مبارک لہولہان ہوگیا تو آپؐ نے اس حالت میں بھی صرف یہ ارشاد فرمایا:

"وہ قوم کیونکر فلاح پا سکتی ہے، جس نے اپنے پیغمبر کو زخمی کر دیا

اور پھر یوں دعا فرمانے لگے:

"اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ یہ بے علم ہیں"

معلوم ہوا کہ انسان کی شخصیت کی پختگی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل فرمانبرداری سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی

فکری اور عملی رہنمائی سے تمدن اور نظام حیات صحیح رُخ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ احکام الٰہی کے صحیح مفہوم کو سمجھنے اور منشا الٰہی کے مطابق زندگی کا سارا نظام قائم کرنے کی وہی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالٰے پر پختہ یقین کے بعد، رسالت پر کامل یقین کے بغیر اللہ تعالٰے کی ہدایات پر کما حقہٗ عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے علماؑ کے نزدیک کسی شخص کا ایمان مکمل نہیں جسکا حضور نبی کریمؐ کی رسالت پر پختہ ایمان نہیں۔

دراصل کلمۂ توحید ہی لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے پس اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے بغیر ایمان کب مکمل ہو سکتا ہے اور جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم عقیدۂ توحید اور عقیدۂ آخرت کی اہم ترین کڑی ہیں نیز یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ معراج النبی کے مشہور موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں پیش آنے والے بہت سے حقائق مناظر۔ جنت، دوزخ اور عذاب کی نوعیت سے بھی آگاہ فرمایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ان مشاہدات کی روشنی میں انسانی اعمال کی درستگی کا جو نمونہ آپؐ پیش کریں گے اس سے بہتر کوئی اور پیش نہیں کر سکتا۔

منصب نبوت کے فرائض میں ایک اہم فرض "یزکیھم" یعنی تزکیۂ نفس کا ہے — نفوس کی تربیت اس طرح کرنا کہ اخلاق رذیلہ نکال کر اخلاق حسنہ پیدا ہوں۔ اسی کی وضاحت قرآن مجید میں ایک اور جگہ اسطرح فرمائی گئی "لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دے دی۔ ایسے لوگ راہ راست پر ہیں۔" (الحجرات - ۸)

یہاں یہ یاد رہے کہ کتاب ہدایت کا اہم ترین مقصد ہی یہ ہے کہ قلوب اور

نفوس کی اصلاح ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فرض کی بھی بدرجۂ اتم تکمیل فرمائی جس کا زندہ ثبوت صحابۂ کرامؓ کی جماعت ہے جن کے نفوس آپؐ کی تربیت سے ایسے مصفےٰ ہو گئے تھے کہ وہ خدمتِ خلق اور ایثار کے جذبہ سے ہمیشہ سرشار رہتے۔ وہ بے جا نفسانی خواہشات اور فسق و فجور سے متنفر ہو گئے اور وہ اخلاقی پستیوں سے نکل کر ایمان و اخلاق کے بلند ترین مقام تک پہنچ گئے۔ جب تک اسلام کا حسن صحابہ کرام کے کردار کی صورت میں موجود رہا بحث و دلائل کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے دیکھ لینے ہی سے اسلام کی حقیقت سمجھ میں آجاتی تھی۔

غازیانِ اسلام کی عظیم فتوحات کے باوجود آرام طلبی، تن آسانی — اور عشرت کوشی صحابہ کرامؓ کا مقصودِ حیات نہ تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں کی خوشحال زندگی ان کے افکار و خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرسکی۔ قبار یہ کی فتح کا پیغام لے کر ایک نوجوان عرفجہ بن مازنؓ جب مدینہ پہنچا تو اس کے بدن پر قیمتی لباس تھا۔ اسلامی لشکر کے قاصد کو اس شان میں دیکھ کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا۔ اُنہوں نے غضبناک ہو کر کہا کہ — "مازنؓ کے بیٹے! تجھے خدا تعالےٰ کے برگزیدہ رسولؐ کا وہ طرزِ عمل پسند نہیں جو حضورؐ کو مرغوب تھا؟ یہ کیا عورتوں کی سی وضع بنا رکھی ہے؟ جو روپیہ تم نے اس لباس پر صرف کیا ہے وہی اگر غربا، و مساکین پر صرف کیا جاتا تو کیا حرج تھا؟" فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ ایک دن میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ چٹائی پر لیٹے تھے اور آپؐ کے جسم پر چٹائی کے نشانات نظر آرہے تھے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! خدا تعالےٰ کے دشمن قیصر و کسرائے تو نرم گدوں پر

آرام کریں اور خدا تعالےٰ کے محبوب چٹائی پر سوئیں ؟ حضورؐ نے فرمایا : عمرؓ!
کیا تمہیں پسند نہیں کہ اُن کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت ؟

عیاض بن غنم الجزیرہ کے گورنر تھے۔ کسی نے حضرت فاروق اعظمؓ کو اطلاع دی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں (جو ناز و نعم کی علامت ہے) حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بھیجا کہ انہیں جس حال میں پائیں پکڑ لائیں۔ جب وہ امیر المومنین کے حضور آئے تو انھوں نے ان کے باریک کپڑے اتروا کر موٹے کمبل کا ایک کرتہ پہنا دیا اور ہاتھ میں ایک لاٹھی دے کر کہا کہ تم انسانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو، اس لئے آج سے بیت المال کے ریوڑ چراؤ۔

تاریخ اسلام میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ عظیم ترین انسانوں نے حضور علیہ السلام کے غلاموں کو دیکھا تو ان سے چند لمحوں کی گفتگو نے ان کی زندگیوں کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

ابو اسحٰق سے روایت ہے کہ جب رومی مسلمانوں سے شکست کھا کر انطاکیہ آئے تو ہرقل نے پوچھا تھا مجھے بتاؤ وہ کیسے لوگ ہیں اور تم نے ان سے شکست کیوں کھائی تو ایک بوڑھے سردار نے کہا تھا : "وہ رات کو عبادت کرتے ہیں، دن کو روزہ رکھتے ہیں، عہد پورا کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں۔ آپس میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں ——— اور ہم شراب پیتے ہیں، بدکاری کرتے ہیں حرام کے مرتکب ہوتے ہیں۔ عہد توڑتے ہیں۔ ایکدوسرے کو برائی کی تلقین کرتے ہیں، زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ہرقل نے کہا : تم سچ کہتے ہو۔" [۱]

---

[۱] رسالہ مجالسہ از احمد بن مروان مالکی

ایسا ہی ایک واقعہ ایران میں پیش آیا جب شاہ ایران نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے پوچھا کہ تمہارے خلیفہ میں کونسی ایسی خصوصیت ہے جس کے باعث ہر تدبیر ہم آہنگِ تقدیر ثابت ہوتی ہے تو حضرت معاذ بن جبل رضؓ نے فرمایا تھا کہ :

"وہ نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں اور نہ کسی سے دھوکا کھاتے ہیں۔"

۴ - اللہ تعالےٰ کے فرشتوں پر یقین

نظامِ کائنات میں کچھ ایسے امور ہیں جو صرف اللہ تعالےٰ کے فرشتوں کے ذریعہ ہی انجام پاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی مخلوق ہیں جو اللہ تعالےٰ کے ہر حکم کی حسبِ منشاءِ الٰہی تعمیل کرتے ہیں۔ کبھی نافرمانی نہیں کرتے :

"جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجالاتے ہیں۔"

اطاعتِ الٰہی کرنا ان کی فطرت ہے۔ کچھ مقربین بارگاہ فرشتے ہیں جن میں جبرائیل - میکائیل - اسرافیل اور عزرائیل ہیں۔ جو اللہ کے ان فرشتوں کے مخالف ہیں ان پر اللہ تعالےٰ کی لعنت کی وعید ہے۔ حضرت جبرائیل کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے اپنے احکام پیغمبروں کو پہنچائے۔ کراماً کاتبین ہیں جو ہر انسان کے نیک و بد اعمال کا ریکارڈ مرتب کرنے پر مامور ہیں۔ کچھ سزا اور جزا دینے پر مقرر ہیں۔ کچھ انسانوں کی نگہبانی اور حفاظت پر تعینات ہیں۔ کچھ اللہ تعالےٰ کے حکم سے اس کے بندوں کو غیبی امداد فراہم کرتے ہیں، اور بعض رب قدوس کی حمد و ثنا پر ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں، ان کی تعداد کا کوئی شمار نہیں۔ روئے زمین اور آسمانوں میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں فرشتے ڈیوٹی پر موجود نہ ہوں۔ ایسے

مکمل نظام کا تصور، انسان کو ہر وقت اور ہر جگہ محتاط رہنے پر مجبور کرتا ہے — یہ عقیدہ انسان کو کسی برائی کے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے فوری طور پر روک دیتا ہے کیونکہ اُسے ڈر ہے کہ کراماً کاتبین اس کے بُرے عمل کو بھی اس کے اعمال کی فہرست میں درج کر لیں گے جو کبھی مٹ نہ سکے گا اور پھر روز حساب اس کے باعث اللہ جل جلالہٗ کے روبرو سخت ذلت اٹھانی پڑے گی بلکہ ساری اُمتوں کے سامنے سرِعام رُسوائی ہوگی۔ اس رسوائی کا تصور ہی انسان کو برائیوں کیطرف رغبت کرنے سے باز رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر یقین

اس عقیدہ کی اہمیت کے متعلق پہلے ہی طویل بحث کی جا چکی ہے قارئین ملاحظہ فرمائیں۔

اگر یہ کتاب ہدایت (قرآن) اپنی اصلی حالت میں موجود نہ ہوتی۔ تو اس زمانہ میں نوع انسانی کی ہدایت کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ ہی میسر نہ آتا۔ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالےٰ کی بے شمار صفات معتقدہ کی اصلاح، مقصد زندگی اور تزکیۂ نفوس کا علم انسانوں کو حاصل ہوا۔ اور ان ہدایات کی روگردانی سے جو ہولناک مصائب دنیا اور آخرت میں رُونما ہوتے ہیں ان سے بھی پوری آگاہی نصیب ہوئی، ورنہ صالح معاشرہ کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

٭

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت

متذکرہ بالا عقائد خمسہ کی بنیادی اہمیت واضح ہوگئی۔ اس سلسلہ میں چند ضمنی عقائد بھی خاصے اہم ہیں جن کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے :

جیسا پہلے عرض کیا گیا کہ امت مسلمہ کو بہترین اُمت ہونے کی فضیلت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ :

"تم حکم دیتے ہو (لوگوں کو) بھلائی کے کاموں کا اور روکتے ہو برائی سے۔" (آل عمران — ۱۱۰)

ایک اور آیت میں ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ :

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کیطرف بلایا کریں اور نیک کام کے کرنے کو کہا کریں اور بڑے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔" (آل عمران : ۱۰۴)

تاریخ گواہ ہے کہ سابقہ اُمتوں کی تباہی اور بربادی کی سب سے بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ بھلائیوں کے پھیلانے اور بداعمالیوں کو روکنے کے فرض سے غافل ہو گئے تھے۔ وہ برائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھتے لیکن اُن سے کراہت اور نفرت کا کوئی جذبہ ان میں پیدا نہ ہوتا تھا۔ بالآخر برائیوں نے وبائی شکل اختیار کرلی، ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ مذہب میں اس کو اجتماعی عذاب الٰہی کہا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے مقرر کردہ فطری اصولوں سے انحراف کا یہی انجام ہوتا ہے۔

بطور خلیفۃ الارض ہر شخص کی یہ انفرادی ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر نہ صرف خود عمل پیرا ہو بلکہ دوسروں کو بھی عمل کرنے کی تاکید کرے جیسا کہ ارشاد فرمایا :

"مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال حسنہ کی) پابندی کی تاکید کرتے رہے۔" (سورۃ العصر)

اس لئے جب تک ہر انسان کے دل میں یہ احساس اور جذبہ نہ ہو کہ احکامِ الٰہی کی پابندی کرانا اس کی ذاتی ذمہ داری ہے اور وہ روزِ حساب، اس فرض میں کوتاہی کا جواب دہ ہوگا، اس وقت تک معاشرہ کی صحت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ جو شخص برائی روکنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اُسے روکنے کی کوشش نہیں کرتا وہ خدا تعالےٰ کے نزدیک مجرم ہے۔ زبان کے ذریعہ روک سکتا ہو تو کلمۂ خیر کہنے میں دریغ نہ کرے اور اگر یہ بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے بُرا سمجھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سارے انسان ہی اس فرض سے غفلت برتیں تو سارا معاشرہ ہی برائیوں میں ملوث ہو جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو مبادا وہ وقت آجائے کہ تم دعا مانگو اور قبول نہ ہو، تم سوال کرو اور سوال پورا نہ کیا جائے۔ تم اپنے دشمنوں کے خلاف مجھ سے مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کروں" (ابن ماجہ) اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ اگر کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ جماعت اور قوم باوجود قدرت رکھنے کے اُس شخص کو اس گناہ سے نہیں روکتی تو اُن پر مرنے سے پہلے دنیا ہی

میں عذاب مسلّط ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ؐ ہے کہ:

"اس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف موڑ دو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح تم سے پہلوں پر کی تھی۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ خداوند عالم نے ایک بستی کو مقہور کیا جہاں اٹھارہ ہزار آدمی پیغمبروں کی سی عادات کے موجود تھے۔ تو لوگوں نے وجہ دریافت کی۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ وہ لوگ ان کو برائیوں سے منع نہ کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شہداء میں کون افضل ہے تو فرمایا کہ جو بادشاہ کو ہدایت کرنے میں قتل کیا جائے۔ یہ بھی آپ ؐ کا فرمان ہے کہ بہترین ہجرت یہ ہے کہ تو اس چیز کو چھوڑ دے جسے تیرا رب ناپسند کرتا ہے۔

یہ اس عقیدہ کی خصوصیت ہے کہ اگر زندگی کے ہر شعبے میں یہ اصول اور جذبہ ہر شخص کے پیشِ نظر رہے تو معاشرہ میں خرابی پیدا ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ حیات انسانی کا نصب العین ہی فتنہ وفساد کا خاتمہ ہے۔ باقی فرائض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضؓ جیسے تربیت یافتہ انسانوں کے نزدیک تجارت میں خسارہ کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن دین کے خسارے کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

سورۂ رعد کی تفسیر میں صاحبِ تفسیر روح البیان تحریر کرتے ہیں کہ

ایک بزرگ سے رب العالمین نے ارشاد فرمایا کہ میں نے عالم کی ساری چیزیں تیرے لئے بنائیں تو نے میرے لئے کیا کیا۔ انہوں نے اپنی عبادات پیش کیں ارشاد الٰہی ہوا: کہ یہ عبادتیں بھی تو نے اپنے لئے کی تھیں تاکہ دوزخ سے بچ جائے۔ اور جنت حاصل کرے۔ میرے لئے کیا کیا۔ عرض کیا: مولا پھر تیرے لئے کیا کام ہوتا ہے فرمایا: میرے پیاروں سے محبت اور میرے دشمنوں سے عداوت (یعنی تو ان لوگوں سے محبت رکھ جو اللہ تعالےٰ سے محبت رکھتے ہیں اور ان کا دشمن ہو جا جو رب کی نافرمانیاں کرتے ہیں اور اس کی ہدایات کو جھٹلاتے ہیں۔ تیرے اعمال کی کسوٹی الحبّ فی اللہ اور البغض فی اللہ میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہی عمل تھا جس کا ذکر قرآنِ حکیم نے ان الفاظ میں فرمایا:

"اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ میری نماز اور قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو یہی حکم ہوا ہے۔" (الانعام: ۶: ۱۶۲-۱۶۳)

جذبۂ ایثار و قربانی:

یہ جذبہ یقیناً ہر انسان سے قربانی کا مطالبہ کرتا ہے کہیں جان کی، کہیں مال کی، کہیں وقت کی، کہیں محنت کی اور کہیں محبت کی اور اس قربانی کا مطالبہ اس لئے ہے کہ باقی انسانیت کی بقا اور ترقی کا سامان فراہم کیا جائے کیونکہ ہمارا تصورِ حیات ایک خالص عملی تصور ہے محض چند عقائد کے ماننے اور عبادات کے کرنے کا نام زندگی نہیں بلکہ یہ نتیجہ خیز دین ہے ایک مکمل نظامِ حیات جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔

یہ اسی تصور ہی کی کرشمہ فرمائی ہے کہ جنگ تبوک میں منجملہ بہت سے

شہداء کے جب حضرت حذیفہ رضؓ کے چچازاد بھائی بھی شہید ہوئے تھے۔ تو حضرت حذیفہ رضؓ نے چاہا کہ ان کو ایک گلاس پانی پلادیں۔ چنانچہ گلاس اس کے پاس لے گئے اور پانی پلانے کا ارادہ کیا کہ برابر سے دوسرے زخمی نے "العطش العطش" کہا۔ ان کے بھائی نے اشارہ کیا کہ اول اس کو پلایا جائے۔ وہ اُنکے پاس لے گئے تو تیسرے زخمی نے کراہتے ہوئے پانی مانگا۔ اس کی آواز سے اس زخمی نے اس تیسرے پیاسے کیطرف اشارہ کیا کہ اسے پہلے پلادیا جائے چنانچہ حضرت حذیفہ رضؓ پانی کا گلاس ان کے پاس لے گئے لیکن وہ دم توڑ چکے تھے

اسی طرح ایک بزرگ حضرت انطاکی رحؒ کا ایک گروہ ایک جگہ جمع ہوا کھانے کے وقت روٹیاں کچھ کم تھیں۔ اس کے ٹکڑے کر کے سامنے رکھ لیے تاکہ سب مل بانٹ کر کھالیں۔ چراغ گل کر دیا گیا۔ بعد میں جب چراغ روشن کیا تو کسی نے بھی اس خیال سے کھانا نہ کھایا تھا کہ میں نہ کھاؤں اور دوسرے ساتھی سیر ہو کر کھالیں۔

لیکن یہ جذبہ خلوص نیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا اور اس کا دار ومدار محبت پر ہے۔ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ ہو تو یہ ذوق عمل دیرپا ثابت نہیں ہو سکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض صحیح طور پر اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب خلوص پر مبنی اور نفسانی خودغرضیوں سے پاک نیت کارفرما ہو۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایک مخلص دوست کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

اِنسان کی آزمائش

دیکھا جائے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم میں عوام الناس کی بڑی

آزمائش ہے ۔ یعنی پیغام ہدایت پہنچانے کا اہم فریضہ سب سے بہتر کس نے انجام دیا۔ دوسروں کو راہِ راست پر لانے کا سب سے اچھا نمونہ کس نے پیش کیا۔ خود کس حد تک ان ہدایت کے مطابق زندگی بسر کی ۔ کتنے ایثار اور قربانی سے کام لیا۔ کیا سہولتیں لوگوں کو فراہم کیں۔ ان کے راستوں میں رکاوٹیں تو نہیں ڈالیں۔ اس عارضی زندگی میں دنیوی لذتوں ، اور رنگینیوں سے دھوکا کھا کر راہِ ھدایت سے بھٹک تو نہیں گیا۔ بیجا نفسانی خواہشات اور لہو ولعب کے جال میں تو نہیں پھنسا : اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا:۔

" اور ہرگز ان چیزوں کیطرف آپ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کیلئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے ۔" (قرآن کریم)

نیز ارشاد باری تعالےٰ ہے :

" بیشک جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کی زینت بنایا تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون سب سے اچھے عمل کرتا ہے ۔"
(الکھف ۔ ۱۸)

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا :

" اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت کر دیتا ۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ وہ تمہیں ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تمہیں دی ہیں تو بھلائیوں کی طرف سبقت چاہو ۔" (المائدہ ۴۸)

ھدایت پانے والوں کی شناخت بھی یہ فرمائی "اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں

گے کسی قدر خوف اور بھوک اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور بشارت دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم تو صرف اللہ ہی کے لئے ہیں ۔ اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے نوازشیں اور رحمت ہے ۔ اور یہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں ۔ (البقرہ ۱۵۵ تا ۱۵۷)

اِس آزمائش میں حکمت یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اطاعت اور اخلاص کے دعوے میں کون سچا ہے کیونکہ اخلاص کی پہچان دعویٰ نہیں عمل ہے محض خلوص کے فریب دینے سے اصلاحِ معاشرہ کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا ۔

اِسلامی اخوّت

دین فطرت کا ایک نمایاں اصول یہ ہے کہ انسانوں کو رنگ و نسل یا لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر تقسیم کر کے منتشر نہ کیا جائے بلکہ انھیں ایک عالمگیر برادری میں مدغم کیا جائے تاکہ یکسانیت اور مساوات کے جذبات کو فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

اور مضبوط پکڑے رہو اللہ کی رسی کو اور باہم نااتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالےٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالےٰ نے تمھارے قلوب میں الفت ڈال دی۔ سو تم اللہ تعالےٰ کے انعام سے بھائی بھائی ہو گئے ۔" (آلِ عمران - ۱۰۳)

اِس اصول میں انسانیت کی اجتماعی فلاح و بہبودی کا عنصر غالب ہے حضور رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ عِیَالُ اللّٰہِ ط یعنی ساری مخلوق اللہ تعالےٰ کا کنبہ ہے

یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

مصر کی الازہر یونیورسٹی کے ریکٹر شیخ محمود شلتوت نے کہا تھا کہ اخوت کا تصور سماجی حقوق اور فرائض کی ادائیگی کا بہترین مظہر ہے۔ اور یہ رحم دلی، باہمی محبت، رواداری اور اتحاد جیسے اعلےٰ اخلاقی جذبات اور احساسات ابھارنے کے لئے نہایت موثر محرک ہے۔ اسی جذبہ کے تحت سوسائٹی میں اچھائیاں پروان چڑھتی ہیں ۔ اور برائیوں کا انسداد ہوتا ہے ۔

ایک مغربی مفکر ربناں کے الفاظ بھی قابل توجہ ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"اسلام ایک ولولہ انگیز محیر العقول طاقت ہے جو زبان، جنسیت، وطنیت اور مزاج کے اختلاف کے باوجود اپنے حلقہ بگوشوں کو ایک کر دیتی ہے"

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ:

"اسلام کا نظام ایک ایسا نظام ہے جس کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کے نزدیک انسان کی ہستی پودوں اور درختوں کی طرح کسی خاص حصہ زمین سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جس کا تعین اجتماعی ترکیب کی اصطلاح سے کیا جاتا ہے۔ (خطبہ صدارت اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

آنحضرت رحمۃ اللعٰلمین صلے اللہ علیہ وسلم نے تو آج سے چودہ سو سال پہلے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اسلامی اخوت کے منشور کا اعلان فرما دیا تھا۔

"اے لوگو! یاد رکھو کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت و ناموس ایک دوسرے پر اسی طرح محترم ہیں جس طرح آج کا دن، آج کا مہینہ اور تمہارا یہ شہر (مکہ مکرمہ) تمہارے نزدیک محترم ہے ۔

یہ وہ زریں اصول ہے جو افراد کو بتدریج منتج کر کے ایک ملت واحدہ کی صورت میں منظم کرتا ہے اور تفریق پسند ذہنیت کی نفی کر دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

"مسلمان تو بھائی بھائی ہیں۔ تو اپنے دو بھائیوں میں میل جول کرا دیا کرو۔ اور خدا سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۴۹-۱۰)

ایک حدیث میں وارد ہوا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام دنیا محفوظ رہے۔ حضرت امام جعفر صادق کا قول ہے کہ کسی کے ساتھ برائی مت کرو ورنہ خدا تعالے برائی کرنے والے پر کسی کو بدلہ لینے کیلئے مقرر کر دے گا۔

اعلےٰ ترین درجہ ایمان کا یہی ہے۔ کہ انسان جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دوسرے کیلئے پسند کرے۔ جو اپنے لئے بُرا سمجھے وہی دوسروں کے لئے بھی بُرا سمجھے۔ دنیا تو بہت بڑی ہے۔ اس کا معیار تو یہ ہونا چاہیئے کہ کم از کم جس ماحول میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں اس میں محبت پیدا کرنے میں مدد دیں۔ اور حضور رحمۃ اللعلمین کی اتباع کر کے ہم بھی معاشرہ کے لئے رحمت بن جائیں ۔ اور اگر کوئی بھلائی نہ کر سکیں تو حسن سلوک ہی سے پیش آئیں جس سے دوسروں کی ڈھارس تو بندھ جائے۔ صالحین کا ہمیشہ سے اسی پر عمل رہا ہے۔ ایک ولی اللہ نے کیا خوب کہا:

"علی الصباح عالم علم کی اور زاہد زہد کی زیادتی طلب کرتا ہے اور ابوالحسن اسی فکر میں رہتا ہے کہ مسلمان بھائی کے دل کو کوئی خوشی پہنچ جائے۔" (حضرت ابوالحسن خرقانیؒ)

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است

در جہاں دست و زبانش رحمت است (اقبال)

دراصل، اسلام امتِ واحدہ یعنے وحدتِ انسانی کا مبلغ ہے، جو اخوت کے تصور سے بھی بالاتر ہے۔

حقوق العباد

حقوق العباد کی ادائیگی کی اس اسلامی اخوت کے عقیدے سے تحریک ہوتی ہے۔ اگر حقوق العباد کی ادائیگی کی فضیلت کا یقین نہ ہو اور ان سے صرفِ نظر کرکے نقصانات کا احساس نہ ہو، تو اصلاح معاشرہ کا جذبہ کسی انسان کے دل میں کیسے موجزن ہو سکتا ہے۔ یہ جذبہ اللہ تعالےٰ پر پختہ یقین کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ جو حقوق اللہ کی ادائیگی میں مخلص نہیں، اسے حقوق العباد کی ادائیگی کی کب فکر پیدا ہوگی۔

حقوق العباد اسی لئے ہیں کہ زندگی کا نظام ٹھیک طرح سے چلے۔ اس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ حقوق اللہ تو اللہ تعالےٰ معاف ہی کر دیں گے، تو پھر لوگ حقوق اللہ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے اور غافل ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف حقوق العباد کو اتنی اہمیت دینے کے باوجود کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالےٰ بھی معاف نہیں کر سکتے، یہ صورتحال ہے کہ انہیں ادا کرنے میں سخت کوتاہی برتی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ جب تک حقوق اللہ ادا نہ کئے جائیں گے، حقوق العباد ادا کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ عبادات ہی سے روح کو قوت اور ذہن کو نظر حاصل ہوتی ہے۔ جس سے حقوق العباد کی پہچان ہو جاتی ہے اور انھیں ادا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ عبادات کا مقصد ہی انسان کو متقی و پرہیز گار بنانا ہے۔ جو متقی بن جائے گا، وہ حقوق العباد کی ادائیگی سے کب جی چرائے گا۔ وہ تو حقوق العباد کی ادائیگی کو اپنے لئے ذریعۂ نجات قربِ خداوندی اور رضائے الٰہی کے حصول کا سب سے اہم سبب جانے گا۔

حقوق العباد کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اسلامی فکر و نظر میں مطالبات کا

تصور نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر مغربی تہذیب میں مطالبات کا تصور سرفہرست ہے
دوسروں کے حقوق کی ادائیگی، ایثار و قربانی اور بے لوث خدمتِ خلق اور حسن اخلاق
دین اسلام کی اصل روح ہے۔ تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ سمجھ کر انکے ساتھ
محبت اور رواداری کا سلوک کرنا ہی وہ بنیادی اصول ہے جس پر صالح اور پاکیزہ
معاشرہ کی عظیم عمارت تعمیر ہوسکتی ہے اور اسی سے معاشرے
کو بُری عادات اور خصائل رذیلہ سے پاک کرکے انسانوں کو پُرامن اور پرسکون زندگی
بسر کرنے کیلئے سازگار ماحول فراہم کیا جاسکتا ہے۔

زکوٰۃ

حقوق العباد میں اوّلین اہمیت زکواۃ کی ادائیگی کو حاصل ہے۔ یعنی جس مسلمان
کے پاس ایک مقررہ مقدار میں مال و دولت ہو، وہ ہر سال اس کا چالیسواں حصہ غریبوں
حاجت مندوں اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کی مختلف مدوں میں خرچ کرنے کے لئے
حکومت کے بیت المال میں جمع کرادے۔ یا اگر ایسا کوئی نظام موجود نہ ہو تو خود خرچ
کردے۔ اس حق کی ادائیگی کی اہمیت اِس سے لگائی جاسکتی ہے کہ قرآنِ کریم میں
اکثر مقامات پر نماز قائم کرنے کے ساتھ زکواۃ دینے کا حکم ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا
کہ زکواۃ ادا نہ کرنا مشرکانہ اور کافرانہ فعل ہے۔

"ان مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے۔ اور ان کا انجام بہت بُرا ہونے
والا ہے جو زکواۃ ادا نہیں کرتے اور وہ آخرت کے منکر اور کافر
ہیں۔" (فُصِّلَت - ۱)

اور سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا:

" اور جو لوگ سونا چاندی جوڑ کر رکھتے ہیں اور اِس کو خدا کی راہ میں خرچ

نہیں کرتے (یعنی صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکواۃ ادا نہیں کرتے)
اے رسولؐ! آپ انھیں سخت دردناک عذاب کی خبر سنا دیں
جس دن کہ تپایا جائے گا ان کی اس دولت کو دوزخ کی آگ میں،
پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کی کروٹیں اور
پیٹھیں (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ مال و دولت جس کو تم نے جوڑا
تھا اپنے واسطے، پس مزا چکھو اپنی جوڑی ہوئی دولت کا۔" (التوبہ-۳۵)

اس کے برعکس زکواۃ ادا کرنے والوں کو روزِ قیامت نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم

"جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر نہ احسان جتاتے
ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں، ان کے واسطے ان کے رب کے پاس
بڑا ثواب ہے۔ اور انھیں قیامت میں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ
غمگین ہوں گے۔ (البقرہ - ۲۶۲)

اِس دَور میں مسلمانوں میں برائیوں کی بڑی وجہ معاشی بدحالی ہے۔ اگر حکومت کی سطح پر نظامِ عشر اور زکواۃ نافذ کر دیا جائے تو دولت کی منصفانہ تقسیم کے ذریعہ غریبوں اور مسکینوں کو خوشحال بنا کر معاشرہ کے لئے مفید بنایا جا سکتا ہے اور مستحق اشخاص کی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد باقی رقم فلاحی کاموں میں لگا کر صحت مند معاشرہ کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ پھر ہمیں دوسری قوموں کا دستِ نگر ہونے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ جب عوام الناس خوشحال اور آسودہ ہو جائیں گے تو بہت سی معاشی اور اخلاقی برائیوں اور جرائم کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

رشتہ داروں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق

معاشرتی آداب حقوق العباد کی ادائیگی کی ہی ایک صورت ہے۔ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اللہ تعالےٰ کے حق کے بعد سب سے بڑا حق ہے۔ ان کی خدمت کرنے میں، اللہ تعالےٰ کی خوشنودی اور ان کی ایذا رسانی اللہ تعالےٰ کی ناراضگی کا موجب ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ماں باپ کی رضامندی میں اللہ کی رضامندی اور ماں باپ کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے۔" ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اولاد پر ماں باپ کے کیا حقوق ہیں تو آپ نے فرمایا "اولاد کی جنت اور دوزخ ماں باپ ہیں" یعنے ان کی اطاعت جنت میں اور نافرمانی اور بدسلوکی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

اسی طرح اولاد کا حق ماں باپ پر یہ ہے کہ ان کی اچھی تربیت کی جائے تاکہ وہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہیں۔ میاں۔ بیوی کے حقوق بھی حسن سلوک لطف ومحبت اور باہمی خیر خواہی پر مبنی ہیں۔ قرابت داروں کے حقوق کے بارے میں ایک حدیث میں ہے کہ "قرابت کے حقوق پامال کرنے والا اور اپنے برتاؤ میں رشتہ داری کا لحاظ نہ رکھنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔" اسی طرح بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت کرنا بھی اہم حقوق ہیں۔

قرابت داروں کے بعد پڑوسیوں کے حقوق کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ قرآن اور احادیث میں ان کے متعلق مفصل ہدایات ملتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کی شرارتوں سے اس کے پڑوسی امن میں نہیں۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ "وہ مسلمان نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور پہلو میں رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔"

اسی طرح یتیموں، مسافروں، بیماروں، قیدیوں اور دیگر حاجت مندوں کے حقوق ہیں جنکا ادا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ ان پر ظلم و زیادتی کرنا روا ہے اور نہ ان کو مصیبت میں تنہا چھوڑ دینا مناسب ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ تعالٰے اس کی حاجت (پوری کرنے) میں لگا رہے گا۔ اور جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی کی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالٰے اس کے بدلے میں قیامت کی کسی تکلیف سے اس کو نجات دے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالٰے قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

دُنیوی معاملات

دنیوی معاملات میں دوسرے انسانوں کے حقوق کا خیال رکھنا انتہائی اہم ہے۔ لیکن سب سے زیادہ کوتاہی انھیں حقوق کی ادائیگی میں دیکھنے میں آتی ہیں، حالانکہ ان کے بارے میں کتاب و سنت میں سخت تاکیدیں آئی ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے:

"اے ایمان والو! تم کسی غلط اور ناجائز طریقے سے دوسروں کا مال نہ کھاؤ۔"

سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالٰے تم کو حکم دیتا ہے کہ جن لوگوں کی جو امانتیں (اور جو حق) تم پر ہوں ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرو۔"

دکانداروں کو ناپ تول میں دھوکہ بازی اور بے ایمانی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ:

"اِن کم دینے والوں کے لئے بڑی تباہی ہے جو دوسرے لوگوں سے

جب ناپ کر لیتے ہیں تو پورا" لیتے ہیں اور جب خود دوسروں کیلئے ناپتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔" (سورۃ تطفیف)

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین نشانیاں بتائی ہیں۔ یعنی "جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا اور وعدہ پورا نہ کرنا۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ "جس شخص نے کسی کی زمین کے کچھ حصے پر ناجائز قبضہ کیا تو قیامت کے دن اس کو یہ عذاب دیا جائے گا کہ زمین کے اس ٹکڑے کے ساتھ وہ زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ سب سے نیچے طبقے تک دھنستا چلا جائے گا۔"

اسی طرح رشوت لینے اور رشوت دینے، سود کا لین دین کرنے، حرام طریقے سے مال و دولت حاصل کرنے، تنگ دست سے قرض وصول کرنے میں سختی کرنے اور قرض ادا کئے بغیر مر جانے کے متعلق بھی بہت سے احکام وارد ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "جو جسم حرام مال سے پلا وہ جنت میں نہ جا سکے گا۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ "اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس درہم میں خریدے اور ان دس میں سے ایک درہم حرام ذریعہ سے آیا ہو تو جب تک وہ کپڑا جسم پر رہے گا اس شخص کی کوئی نماز بھی اللہ کے ہاں قبول نہ ہو گی۔ ظاہر ہے کہ جس کا کھانا پینا اور لباس سب حرام کا ہو تو اس کی دعا کی قبولیت کیونکر ممکن ہے۔

بہر حال ان تمام حقوق کی نشاندہی کرنے سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اگر ہمارے فکر و نظر کی اس طرح تربیت کیجائے کہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کی کتنی اہمیت ہے۔ اور اس میں کوتاہی اور نافرمانی کے کس قدر تباہ کن نتائج ہیں۔

تو معاشرے کی بے شمار برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ نیز نظام زکوٰۃ و عشر اور اسلامی سزاؤں کے قانون کے نفاذ سے انشاء اللہ تعالےٰ بیشتر برائیوں کا قلع قمع ہو جانا یقینی ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اور موجودہ زمانہ میں سعودی عرب میں کسی حد تک اسلامی قانون

پر کامیاب تجربہ اور اس کے حوصلہ افزا نتائج دنیا کے سامنے ہیں۔

عدل و انصاف

نیابت الٰہی کا ایک اور اہم فریضہ عدل و انصاف ہے۔ یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جس سے سارا معاشرہ ہی درست ہو سکتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے عدل کے معنی کسی بوجھ کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کرنا ہے کہ کسی ایک حصہ میں کمی بیشی نہ ہو اگر کسی نے کوئی جرم یا برائی کی تو اس کے برابر اس سے بدلہ لیا جائے۔ اس کا نام "عدل" ہے۔ لیکن اگر اس سے زیادہ بدلہ لیا جائے یا سزا دی جائے تو وہ "ظلم" کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ہمارے ساتھ نیکی کرے تو اس کی نیکی کے برابر بدلہ دینا 'عدل' ہے لیکن اس کی نیکی سے زیادہ بہتر سلوک کرنا "احسان" ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے دونوں کا حکم فرمایا:

"بیشک اللہ عدل اور احسان کا حکم فرماتا ہے۔" (سورۃ النحل)

چونکہ اسلام، امن و سلامتی کا داعی ہے اس لئے وہ ہر معاملہ میں عدل و انصاف کی سخت تاکید کرتا ہے۔ اور یہ تاکید صرف اپنوں ہی تک محدود نہیں رکھی۔ بلکہ غیروں حتیٰ کہ دشمنوں کے حق میں بھی عدل و انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔ رب کریم کا ارشاد ہے:

"اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس گناہ پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ تم ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ انصاف کرو تقویٰ کی شان کے یہی زیادہ مناسب ہے۔ (المائدہ ۸)

جناب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے دن اللہ سے سب سے زیادہ قریب اور اللہ کو سب سے زیادہ پیارا امامِ

عادل ہوگا (یعنی اللہ تعالےٰ کے حکم کے مطابق انصاف کے ساتھ حکومت کرنے والا حکمران) اور اللہ سے سب سے زیادہ دور اور سخت ترین عذاب میں گرفتار قیامت کے دن امام جابر ہوگا (یعنی ظلم اور بے انصافی سے حکومت کرنے والا حاکم)

یہ عدل وانصاف محض عدالتوں پر منحصر نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی عدل کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ فرائض اور حقوق العباد کے صحیح احساس کے بغیر ممکن نہیں ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کے ساتھ سایۂ رحمت میں سب سے پہلے وہ لوگ آئیں گے جنکا یہ حال ہوگا کہ جب ان کا حق ان کو دیا جائے تو قبول کرلیں اور جب کوئی ان سے اپنا حق مانگے تو وہ بغیر لیت ولعل کے) اس کا حق ادا کردیں اور دوسرے لوگوں کیلئے بالکل اسی طرح فیصلہ کریں جس طرح کہ خود اپنے لئے کریں۔"

اسی طرح گواہی دینے میں بھی انصاف کرنے کی سخت تاکید ہے۔ سورۃ انعام میں ارشاد فرمایا کہ" اور بات کہو (یعنے گواہی دو) تو فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو انصاف کرو"(انعام - ۱۹۲) اِس سے بھی ایک قدم آگے سورۃ نساء میں فرمایا کہ انصاف کرنے میں تیرا دل راضی ہو یا نہ ہو، تیرا کام یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام اور ہدایت کے مطابق فیصلہ کرے۔ ارشاد فرمایا:

"اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار بنو۔ خدا اور خدا کے واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، بہرحال اللہ دونوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات

کبھی یا سچائی سے پہلو بچا یا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ (سورۃ النسآء - ۱۳۵)

اس حکم کی بنیاد یہ ہے کہ نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت صرف اللہ تعالےٰ کو حاصل ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ بندوں کا نگہبان کوئی نہیں۔ اس کے باوجود اگر انسان یہ خیال کرے کہ وہ کسی کو نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس نیت کے ساتھ کسی کیساتھ پورا انصاف نہ کرے تو یہ اس کی غلط فہمی اور بھول ہے۔ فریقین مقدمہ اور ان کے پسماندگان کی پریشانیوں کو دور کرنے پر اللہ جل جلالہٗ خود ہی قادر ہے۔ کیونکہ وہی رب ہماری پرورش کرنے والا ہے۔ اور رحمٰن و رحیم بھی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب اللہ تعالےٰ عدل و انصاف کا حکم دے رہا ہے تو اس کے نائب اور خلیفہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بے انصافی کرے۔ یہی وہ فرض ہے جس کی ادائیگی کے وقت انسان خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر وہ عدل نہیں کرتا تو وہ اس نیابت کا مستحق نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہماری ظاہری آنکھوں سے اس کی عدالت نظر نہیں آتی۔ لیکن وہ اپنی صفت رحیمی کے باعث جزا و سزا میں جلدی نہیں کرتا۔ بلکہ مہلت پر مہلت دیتا ہے اور انسان کو اپنا محاسبہ خود کرنے کا موقع دیتا ہے اور اپنے اعمال کو خود سنوارنے کی فرصت عطا کرتا ہے بلکہ اپنی غلطیوں اور لغزشوں پر نادم ہونے اور توبہ کرنے پر خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ ستار اور غفار بھی ہے۔ وہ اپنے بندوں کی بربادی نہیں بلکہ ان کی اصلاح چاہتا ہے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا عدل ہے اور اسی عدل سے سارا معاشرہ درست ہو جاتا ہے

ایک مرتبہ رومی سفیر مدینہ منورہ آیا اور کسی سے پوچھا کہ تمہارے شہنشاہ کا محل کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے ہاں نہ کوئی شہنشاہ ہوتا ہے اور نہ محل۔

البتہ ایک خادم ضرور ہے جس کو ہم خلیفہ کہتے ہیں - اور وہ اس وقت سامنے کی گلی میں گارا اٹھا رہے ہیں۔ سفیر نے وہاں جاکر پوچھا تو بتانے والے نے کہا کہ وہ دیوار کے سایہ میں ریت پر لیٹے ہوئے ہیں - سفیر ان کے قریب گیا اور کہنے لگا "کیا یہ ہے وہ انسان جس کی ہیبت سے دنیا کے فرمانرواؤں کی نیند اڑچکی ہے، اے عمرؓ (حضرت فاروق اعظمؓ) تم نے انصاف کیا اور تمہیں گرم ریت پر بھی نیند آگئی ہمارے بادشاہوں نے ظلم کیا اور انھیں سنگین حصاروں میں سمور و کمخواب کے بستر پر بھی نیند نہ آسکی -

ایک قبطی نے مصر سے مدینہ آکر دربار خلافت میں شکایت کی کہ مجھے گورنر مصر نے مارا ہے - حضرت فاروق اعظمؓ نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ عمروؓ بن العاص نے گھوڑ دوڑ کرائی - میں نے بھی حصہ لینا چاہا - میرے گھوڑے کو دیکھ کر ان کے صاحبزادے نے کہا کہ یہ گھوڑا میرا ہے - جب میں نے جواب دیا کہ یہ گھوڑا تمہارا نہیں میرا ہے تو وہ مجھے یہ کہکر کوڑے مارنے لگے کہ میں شریف کا بیٹا ہوں تو اپنی زبان درازی کا یہ بدلہ لے - حضرت فاروقِ اعظمؓ نے یہ سنا تو فوراً گورنر مصر کو ان کے فرزند سمیت دربار خلافت میں طلب کیا - وہ آئے تو دادخواہ کو کوڑا دیکر کہا کہ تم اس شریف کے بیٹے کو مارو - قبطی نے تامل کیا لیکن جب انھوں نے تین بار حکم دیا تو قبطی نے گورنر مصر کے روبرو ان کے صاحبزادے کو مارنا شروع کر دیا اور گورنر کھڑے دیکھتے رہے زبان سے اُف تک نہ کر سکے -

ایک حدیث میں ہے کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ فلاں مقام سے مدینہ تک عورتیں سفر کریں گی اور کوئی ان کو چھیڑ نہ سکے گا - لوگ ہاتھوں میں سونا لئے پھریں گے لیکن کوئی مستحق شخص نہ ملے گا جس کو وہ دیا جائے - یہ درحقیقت عدل کا ہی کرشمہ ہوگا کہ ہر شخص اتنا خوشحال اور آسودہ ہوجائے گا کہ لوگ سونا لینے سے بھی انکار کر دیں گے تاکہ کسی دوسرے شخص کو وہ دے دیا جائے -

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی مبنی بر حقائق تھی جو حضرت عمر رضہ کے عہد خلافت میں حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضرت معاذ بن جبل رضہ نے جب اپنے علاقہ مین سے جمع شدہ کل زکوٰۃ کا ایک تہائی حصہ مدینہ بھیجا تو حضرت عمر رضہ کی دریافت پر حضرت معاذ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے جو کچھ بھیجا وہ مقامی ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد بھیجا ہے۔ اسی طرح دوسرے سال زکوٰۃ کا نصف حصہ بھیج دیا اور تیسرے سال زکوٰۃ میں وصول ہونے والی تمام آمدنی مدینہ بھجوادی اور کہلا بھیجا کہ "اب یہاں مجھے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملتا جو اس زکوٰۃ کے عمل کا محتاج ہو"۔
(کتاب الاموال)

اس لیئے فرائض اور حقوق کی ادائیگی

کا احساس نہایت ضروری ہے۔ یہ توازن اللہ پر ایمان، آخرت پر یقین اور عدل و انصاف کے تصور سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ جب ہر سطح پر عدل و انصاف ہوگا تو معاشرہ میں ظلم و فساد باقی نہ رہے گا۔ اسی لئے معاملات کا خیال رکھنا تمام عبادات سے افضل ہے اور اسی پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عبادات کا مقصد انسان کو متقی بنانا ہے

اللہ تعالےٰ کی تمام عبادات کا مقصد ہی انسان میں، اللہ تعالےٰ سے محبت اور پرہیزگاری کے جذبات کا پیدا کرنا ہے۔ عبادات سے انسان میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور پھر متقی انسان برائیوں ہی سے نفرت نہیں کرتا بلکہ وہ تو مشتبہ اور مشکوک چیزوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔ ارشاد سبحانہٗ تعالےٰ ہے

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی (پرہیزگار) بن جاؤ"۔ (البقرہ - ۲۱)

نماز کے متعلق فرمایا:

"اور نماز قائم کرو، بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری
باتوں سے۔" (العنکبوت - ۴۵)

روزہ کے متعلق فرمایا:

"اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے، جیسے کہ تم سے پہلی
امتوں پر بھی فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔"
(البقرہ - ۱۸۳)

زکواۃ کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

"اے پیغمبرؐ" ان لوگوں کے مالوں میں سے زکواۃ لیں، تو (اللہ) زکواۃ سے ان
سے ان کے نفس کو (برائیوں سے) پاک کرے گا۔ اور ان کے درجے بلند
کرے گا۔" (التوبۃ - ۱۰۳)

اسی طرح حج کے سلسلہ میں ارشاد ہوا:

"اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری (تقویٰ)
سے ہے۔" (الحج - ۳۶)

قربانی کے متعلق فرمایا:

اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون - بلکہ
تمہاری پرہیزگاری (تقویٰ) اس تک پہنچتی ہے۔ (الحج - ۳۸)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں مختلف احکام کے ذریعہ
تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی:

اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو۔ جس قدر بھی تم سے ہو سکے۔" (التغابن ۱۶)

انسان کے عزو شرف کا معیار ہی اللہ تعالےٰ کے نزدیک مال و دولت نہیں بلکہ
صرف تقویٰ ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ — تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے

اَتْقٰکُمْ ۔ (الحجرات ۲۳) نزدیک وہ ہے جو تقویٰ میں بڑا ہے ۔

فی الحقیقت تقویٰ ایسی خوبی ہے جس سے رحمت باری بھی جوش میں آجاتی ہے اور امدادِ غیبی کا سبب بن جاتی ہے ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :

" اور جو لوگ اللہ سے ڈریں (اور تقویٰ والی زندگی گذاریں) تو اللہ ان کے لئے مشکلات سے نکلنے کے راستے پیدا کرتا ہے ۔ اور ان کو ایسے طریقوں سے رزق دیتا ہے جس کا ان کو گمان بھی نہیں ہوتا " (الطلاق ۲،۳)

اور تقویٰ کا لباس ہی سب سے اچھا ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کو آلودگیوں سے پاک کر کے علم و حکمت کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالےٰ کا شکر گذار بندہ بن جائے ۔

" اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی ڈالے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے ۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے ۔ تاکہ تم شکر کرو "

مختصر یہ کہ تقویٰ کا یہ اثر ہے کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں ۔ فتنہ و فساد کا سدِّباب ہو جاتا ہے ۔ امن اور خوشحالی حاصل ہوتی ہے اور وہ متقی و پرہیز گار انسان خلیفۃ الارض کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے ۔ پھر اُسے نہ کوئی خوف دنیا اور نہ کوئی اندیشۂ آخرت باقی رہتا ہے ۔ یہ کتنا عظیم انعام ہے ، اللہ تعالےٰ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ۔

ذِکرُ اللہ

ذکرِ الٰہی تمام روحانی بیماریوں کا مؤثر علاج ہے ۔ انسان کے خمیر میں ملکیت کے ساتھ حیوانیت بھی گندھی ہوئی ہے ۔ لہٰذا جب انسان پر حیوانیت اور نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے اعضاء و جوارح ذہن کا ساتھ

نہیں دیتے۔ اور اِس کی سوچ کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اِس حقیقت کی نشاندہی قرآن کریم کی ایک آیت میں اس طرح فرمائی:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ۔ (یوسف-۵۳)

یعنی نفس برائی کا بہت حکم دینے والا ہے۔ حُبِّ مال وحبِ جاہ، بغض و حسد، کینہ و تکبر، بخل و کنجوسی جیسی روحانی بیماریاں نفسانیت کے غلبہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کی محبت اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر غالب آجاتی ہے اور پھر وہ نافرمانی کر بیٹھتا ہے اور اپنے خالق ہی کا باغی بنکر معاشرتی اور اخلاقی برائیوں میں ملوث ہوجاتا ہے۔ اِسی لئے سورۃ منافقون میں متنبہ کیا گیا ہے:

"اے ایمان والو! تمہیں تمھارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں اور جو ایسا کرینگے وہی گھاٹے اور خسارے میں رہنے والے ہوں گے۔" (المنافقون-۹)

ھدایت کے راستہ میں دوسری بڑی رکاوٹ شیطان ہے۔ جس کے متعلق پہلے ہی مفصل بیان کیا جاچکا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے شیطان کو "عَدُوٌّ مُّبِیْن" کہہ کر خبردار کیا ہے۔ اور جو اللہ تعالےٰ کی ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں ان کے متعلق ارشاد فرمایا:

"اور جو شخص اللہ کی نصیحت سے اندھا بن جائے۔ ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں۔ سو وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ ان کو راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں اور یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہِ (راست) پر ہیں۔" (الزخرف-۳۷)

قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ "یہی شیطان کا گروہ ہیں (اور) دیکھو

شیطان کا گروہ ہی گھاٹے میں رہنے والا ہے۔" پس نفس اور شیطان، انسان کے دو بڑے دشمن ہیں۔ ان دونوں دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے ذکر کثیر کا حکم فرمایا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا:

"اور جب تم نماز پڑھ چکو، تو یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے"

یعنی ہر حالت میں اور ہر وقت ذکر اللہ کی تاکید کی گئی ہے تاکہ انسان یادِ الٰہی سے غافل ہو کر، نفس اور شیطان سے مغلوب نہ ہو جائے اور اللہ تعالےٰ کی سرکشی پر نہ اتر آئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شیطان آدمی کے دل پر جم کر بیٹھتا ہے۔ جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جونہی انسان ذکر سے غافل ہوتا ہے تو شیطان جی میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ جو لوگ اللہ کے ذکر سے غافل ہیں وہ شیطان کی گرفت میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ جب تک کثرت ذکر کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل اور روزانہ کا معمول نہیں بنا لیں گے، اُن پر شیطان مسلط ہی رہے گا اور وہ اللہ کی ہدایت سے محروم ہی رہیں گے جو حد درجہ ہلاکت کا باعث ہے۔ لہذا انسانوں کی فلاح اور کامیابی کے لئے ذکر اللہ کی کثرت کا خاص دخل ہے۔ سورۂ انفال اور سورۂ جمعہ دونوں میں ارشاد فرمایا کہ" اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" اسی طرح حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کو یاد کرنے والے کی مثال اور یاد نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے (یعنی یاد کرنے والا زندہ ہے اور نہ یاد کرنے والا مردہ بلکہ مردار ہے۔" (بخاری و مسلم)

ذکرِ الٰہی سے اجتناب کرنے والوں کے لئے اللہ تعالےٰ کی یہ وعید ہے کہ وہ دنیوی زندگی تنگی میں گذاریں گے۔ یعنی ہر وقت دنیا کی حرص میں، ترقی کی فکر میں الجھے

کے اندیشہ میں بے آرام رہیں گے اور اطمینان قلبی حاصل نہ ہو سکے گا۔ سورۃ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا :

" اور جو شخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہو گا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اٹھائیں گے۔ وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہو گا کہ ایسے ہی تیرے پاس ہمارے احکام پہنچے تھے۔ پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جائے گا (طٰہٰ - ۱۲۵ - ۱۲۶)

یعنی ان کی جسمانی آنکھیں تھیں۔ لیکن انھوں نے ہدایت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جب کہ سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا :

" بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی کچھ) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہے وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں " (الحج - ۴۶)

ایسے دل کے اندھوں اور اللہ کی یاد سے غافل لوگوں کی صحبت اور گفتگو بھی، اللہ کے نیک بندوں کے لئے سخت مضر اور گمراہ کر دینے والی ہے۔ کیونکہ ان پر تو نفسانیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا :

" اور (اے پیغمبرؐ) ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور (اس کا یہ) حال حد سے گذر گیا ہے " (الکھف - ۲۸)

آج دنیا ذہنی سکون اور دلوں کے چین کی جستجو میں بیحد سرگرداں اور مضطرب ہے اور کثیر مال و دولت اور ہر طرح کا دنیوی عیش و آرام حاصل ہونے کے باوجود، سکون و اطمینان کی نعمت سے محروم ہیں۔ اس کا علاج بھی کثرتِ ذکر الٰہی بتایا گیا ہے

ارشاد فرمایا:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ
"یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دل چین پاتے ہیں" (الرعد - ۲۸)

نیز ذکر الٰہی سے دامن کے سب داغ دُھل جاتے ہیں۔ دنیا و آخرت کی سعادتیں ہماری جھولی میں سمٹ آتی ہیں اور رضائے الٰہی حاصل ہو جاتی ہے جو مقصود زندگی ہے اور جسے یہ فیضانِ رحمت نصیب ہو جائے تو پھر کونسی اس کی تکلیف ہے جو دور نہ ہو اور کونسی خواہش ہے جو پوری نہ ہو۔ حدیث قدسی ہے کہ:

"اے آدم کے بیٹے! تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا۔ میں تیری ضرورتوں کو پورا کردوں گا۔"

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

رضائے الٰہی

اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

"اور جو ایمان والے ہیں ان کی محبت اللہ تعالےٰ سے بہت شدید ہے" (البقرہ ۱۶۵)

اس اصول میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام اور ہدایات بجا لانے کی توفیق اس کی محبت کے سبب ہے۔ اسی سے باطنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی اللہ تعالےٰ کی اطاعت نہیں کرتا تو اس کا اللہ تعالےٰ سے محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اطاعت نام ہے احکام شریعت کی پابندی کا۔ اعلیٰ ترین عملی نمونہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

"ان سے کہو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری (رسول اللہ کی) اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔" (آل عمران - ۳۱)

جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد گرامی ہے کہ:

"تم میں سے کسی کا ایمان مکمل نہیں۔ جب تک میں اسے اس کے والدین اور اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں (بخاری اور مسلم)

گویا شرعی احکام کی بجا آوری اور اتباع رسولؐ کی توفیق فرط محبت کا نتیجہ ہے۔ اتباع شریعت اسے اللہ تعالےٰ کے ان مخلص بندوں کی صف میں لا کھڑا کرے گی جن سے اللہ تعالےٰ کو محبت ہے۔

ایسا شخص وہ کام کرنا ہرگز پسند نہ کرے گا جو اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کو ناپسند ہو وہ پھر مخلوق کی جھوٹی تعریف سے بھی بے نیاز ہو جائے گا اور محض اللہ سے اپنے اجر کی امید رکھے گا۔ کیونکہ اگر وہ اپنے اچھے کاموں کی داد بندوں سے چاہے گا تو یہ اس بات کی نشانی ہو گی کہ اس کا جذبۂ محبت خالص نہیں۔ ورنہ جو کام خدا کے لئے کیا جائے، تعریف و مدح بھی اسی سے چاہیئے۔ اس اصول کے پیش نظر اللہ کے نیک بندے اپنے نیک اعمال کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ مقصود عمل عوام الناس کی خوشنودی نہیں بلکہ رضائے الٰہی ہے۔ اللہ تعالےٰ کی رضا پر راضی رہنا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا انسان کے ہر قسم کے حالات کو بہتر بنا سکتی ہے۔

" اور جن لوگوں نے اپنے رب کی خوشی کے لئے صبر کیا اور نماز کو درستی سے ادا کیا اور جو ہم نے ان کو (مال) دیا اس میں سے پوشیدہ یا اعلانیہ (اللہ تعالےٰ کی راہ میں) خرچ کیا اور برائی کے بدلے (لوگوں سے) بھلائی کی، ان ہی لوگوں کو عاقبت کا گھر ملے گا۔" (الرعد: ۲۲)

چنانچہ حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "بیٹا! راضی بہ رضا رہنا جھگڑ کر دنیا حاصل کرنے سے بہتر ہے۔ صدیقوں کے دلوں میں راضی بہ

رضا بجنے کی شیرینی، دنیا کی خواہشوں اور لذتوں سے اعلیٰ ہے " نیز آپ نے فرمایا کہ " اگر تم انسِ الٰہی سے خالی ہو گئے تو ایسی خلوت میں، نفس اور شیطان اور حرص تمہارے ساتھی ہوں گے۔ لیکن اگر تمہارا دل اللہ تعالےٰ کی محبت سے بھرپور ہے، پھر تم اپنے اہل و عیال اور قبیلے والوں میں رہتے ہوتے بھی خلوت میں رہو گے جب اللہ تعالےٰ کی محبت تمہارے دل میں بس جائے گی تو پھر تمہیں ہر فعل میں اللہ تعالےٰ کا فضل اور ہاتھ نظر آئے گا اور تم اس کے سوا کسی اور کے ساتھ راضی نہ رہو گے "

تعلق جس نوعیت کا ہو گا، ویسے ہی اثرات مرتب ہوں گے۔ ایک ہی پھول کے جمال کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں، عطار، عرق کھینچنے کے نقطہ نگاہ سے دیکھے گا۔ لیکن ایک شاعر کی روح پر اس کا حسن و جمال جو مستی اور سرشاری طاری کرے گا، اس کی کیفیت کا اندازہ ایک تاجر نہیں لگا سکتا۔ کیف و سرور روح کا خاصہ ہے۔ کیفیتیں صرف محبت کو عطا ہوتی ہیں۔ یعنی وہ پیمانِ محبت جو بندہ اپنی عبودیت کے اعتراف اور اس کے حاکم مطلق ہونے کے احساس کے ساتھ باندھتا ہے۔ اسی کا نام یقین اور ایمان ہے۔ اور اعمال صالحہ اسی کا نتیجہ اور ثمر ہیں۔ ایک معمولی درجے کے انسان سے بھی اس شرط پر تعلق قائم نہیں رہ سکتا کہ اسے ہر مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا جاتے۔ اور ہر جا اور بے جا آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے۔ محبت کی اساس خلوص ہے۔ صحابہ کرامؓ کے متعلق اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم ان سے راضی ہو گئے اور وہ ہم سے راضی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی تھی۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ وہ خدا کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ حضرت ابو بکر شبلی نورادیؒ ایک دن اچھے کپڑے پہن کر مسجد میں گئے تو اندر سے آواز آئی کہ ہماری بارگاہ میں گستاخی سے آتے ہو۔ لوٹے تو

صدا آئی کہ ہماری بارگاہ سے مڑ کر کسی اور جگہ جاتے ہو۔ فریاد کی تو ندا آئی ہم پر الزام لگاتے ہو۔ چپ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ آواز آئی کہ ہمارے سامنے صبر کا دعویٰ کرتے ہو۔ آخر کار عرض کی کہ خدایا تجھ سے تیری ہی رضا چاہتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مبارک جب حج پر گئے تو انھوں نے تجارت کی غرض سے کچھ مشکیزے ساتھ رکھ لئے تاکہ انھیں فروخت کرکے اپنے مصارف پورے کرسکیں لیکن اچانک وہ اِس احساس سے بیتاب ہو گئے کہ حج میں تجارت کیسی؟ یہ سفر تو خالصتاً خدا کے لئے ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ تمام مشکیزے حاجیوں میں تقسیم کر دیئے۔

انھیں کا ایک اور واقعہ ہے کہ آپ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ شدید برف باری میں بار بار آجارہا تھا۔ عبداللہ بن مبارک اٹھکر اس کے پاس گئے اور پوچھنے لگے کہ "بیٹے! بلا کی سردی میں کیوں گھوم رہے ہو۔ کیا سردی نہیں لگتی؟ وہ بولا ایک رئیس کا غلام ہوں۔ وہ سودا سلف لینے کے لئے بار بار بازار بھیج رہا ہے۔ عبداللہ ابن مبارک نے کہا کہ کم ازکم اپنے آقا سے یہی کہو کہ وہ تمہیں کپڑے بنوا دے — تمہاری حالت تو بہت نازک ہے۔ یہ بوسیدہ کپڑے سردی نہیں روک سکتے غلام بولا، حضور آقا سے کیا کہوں؟ میرا حال اس کے سامنے ہے۔ یہ سنکر عبداللہ ابن مبارکؒ تڑپ گئے اور آبدیدہ ہو کر اپنے عقیدت مندوں سے کہنے لگے کہ مقامِ رضا یہ ہے جو اس غلام کو حاصل ہے۔

ظاہر ہے کہ جہاں کسی کو راضی کرنا ہو وہاں اپنے مفادات کی قربانی کرنا پڑتی ہے اور اپنی مرضی چھوڑنا پڑتی ہے۔ خوشبو کی طلب ہو تو غلاظتوں سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔ فیضانِ الٰہی حاصل کرنا ہو تو اس کی مخالف تمام چیزوں سے رشتہ منقطع کرنا پڑے گا۔ جلوؤں کی طلب ہو تو سورج کی روشنی میں آنا پڑے گا اور رحمت

الٰہی کے طلب گار کو عتاب کے مقامات سے اجتناب کرنا ہی پڑے گا ۔ محبت کی یہ پرانی ریت چلی آ رہی ہے کہ وہ غیر کی شرکت کو گوارا نہیں کرتی ۔ خود غرضی اور ذاتی مفاد کا ہلکا سا تصور بھی آ جائے تو آئینہ غبار آلود ہو جاتا ہے ۔ اس گلستان میں تو بہار ہی اسوقت آتی ہے جب آرزوں اور تمناؤں کا خون پیش کیا جاتا ہے ۔

نفسانی خواہشات کی پامالی سے طبیعت میں جو عجز پیدا ہوتا ہے وہی عنایاتِ خداوندی کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔ نفس کی خواہشات مٹ جائیں تو رضا کی کارفرمائی ہونے لگتی ہے اور بندہ بندگی کے قابل ہو جاتا ہے ۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے کے باعث پہچانا ۔ تدبیر جب اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ناکام ہو جاتی ہے تو ایک قادر و قیوم ذات کی موجودگی کا فطری احساس بیدار ہونے لگتا ہے ۔ ورنہ آرزوؤں کی کامیابی انسان کو فرعون بنا دیتی ہے ۔ گدا منعم کے دروازے پر اس وقت جاتا ہے جب اس کا دامن خالی ہو ۔ لہٰذا فوز و فلاح کا دارومدار بھی رضائے الٰہی پر منحصر ہے ۔ رضائے الٰہی اگر دل کی بستی اجڑنے سے حاصل ہو تو پھر بھی یہ سودا مہنگا نہیں ۔ ؎

مجھے خاک میں ملا کر مری خاک بھی اڑا دے

ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

اس کی لذت تو کوئی حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھے جو اپنا سب کچھ نثار کر کے بلال حبشیؓ کو خریدنے چلے گئے تھے ۔ رضائے الٰہی پیش نظر ہو تو مشکلات میں بھی سکون ملتا ہے ۔ اسلام کے پرستاروں کو لٹ لٹا کر حبشہ کیطرف ہجرت کرنے یا مدینہ جانے میں جو روحانی لذت حاصل ہوئی، اس کا عشرِ عشیر بھی قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زندگی گذارنے والوں کو کب نصیب ہوئی ۔ صحابہ کرامؓ کو چیتھڑوں میں ملبوس صحرا کی شدید گرمی میں بھوکے پیاسے رہ کر جہاد کرنے میں جو لذت ملی، وہ صرف

اللہ اور اس کے رسولؐ سے والہانہ محبت کا نتیجہ تھی۔ وہ جان و مال کی قربانی کو رضائے الٰہی کے مقابلہ میں کچھ اہمیت نہ دیتے تھے۔ بلکہ ان کا احساس یہ تھا کہ یہ ربِ کریم کی کرم نوازی ہے کہ جان و مال کا حقیر تحفہ قبول کر کے انمول جیسی عطا فرمائی۔

ابوجہل محبت سے بیگانہ تھا۔ اس لئے معجزات دیکھکر بھی ایمان نہ لایا۔ لیکن صحابہ بدر و حنین کے معرکوں میں تیر کھا کر بھی رقصاں و جولاں دکھائی دیتے ہیں۔ اور عقل حیران و ششدر رہتی۔ عشقِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کی دولت سے محروم دلوں کو یہ سرور و اطمینان کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ محبت الٰہی سے دل منور ہو جاتے تو عقبیٰ کی منزل تک کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ دل میں روشن ہونے والے دیپ طوفانوں کی شورشوں میں بھی روشن رہتے ہیں۔ کوئی حادثہ ان کی لَو کو کم نہیں کر سکتا۔ کاروانِ حیات بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ پریشان کرنے والی ظلمتیں پھر راہ میں حائل نہیں ہوتیں اور اور معاشرہ برائیوں اور غلاظتوں کو دھو کر بھلائیوں اور پاکیزگی کے حسن سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ایسے انسان معاشرہ سے متاثر ہونے کی بجائے خود معاشرہ کی اصلاح کا سبب بن جاتے ہیں کیونکہ نُور کی عطا بھی نُور ہے۔ نور سے تعلق ہو جاتے تو تجلیاں اور تابانیاں ملکر رہتی ہیں۔ سمندر کا ظرف وسیع ہوتا ہے۔ اس کی تو ایک موج ہی دامن کو موتیوں سے بھر دیتی ہے۔ لہٰذا رب کریم سے حُسنِ ظن اسے ایک دن گدا سے شاہ بنا کر چھوڑتا ہے۔

انسان اللہ تعالےٰ کا شاہکار اسی لئے تو ہے کہ اسے عقل و فہم اور اختیار سے نوازا گیا ہے۔ یہ فہم و ادراک اسے خالق تک پہنچا دیتا ہے اور وہ جب اپنے خالق کی صفات کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو اس کا قدر دان بن جاتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے اور اسی کا ہو کے رہتا ہے اور محبت کے تقاضے پورے کرنے کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ نثار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے مجبوراً نہیں

بلکہ اپنے اختیار سے، اس سے راضی ہوکر، اس کی محبت میں، اپنی خوشی سے اور اپنے محبوب کی خوشنودی کیلئے اسی فطری صلاحیت نے اس کو "امانت" کے بارگراں اٹھانے کی ہمت دی اور یہ اسی عشق و مستی کا ثمرہ ہے کہ بالآخر انسان نے نیابت الٰہی کے بلند و ارفع منصب پر پہنچکر قربِ الٰہی اور دیدارِ الٰہی کی ان گنت سعادتیں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔

"(اے نبیؐ) آپ ان لوگوں کو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ایسا نہیں پائیں گے کہ اس شخص سے محبت رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہے، اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی، یا اُن کے کنبے والے۔۔یہی لوگ ہیں جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ان ہی میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اُس سے راضی ہوئے۔۔یہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں۔سن لو کہ اللہ کی جو جماعت ہے، وہی فلاح پانے والی ہے۔" (المجادلۃ - ۲۲)

انسانی فکر و عمل کی تطہیر مقدس فریضہ ہے

اللہ جل شانہٗ نے اپنی شان کریمی اور حکمت کے سبب انسان کو فطرۃً نیک اور صالح پیدا کیا ہے اور اس میں نیکی و بدی کی پہچان کرنیکی صلاحیت بھی ابتداء ہی سے رکھ دی ہے۔

"اس طور پر (پیدا کیا) کہ ہم اسکو مکلف بنائیں، تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سنتا، دیکھتا (سمجھتا) بنایا۔ ہم نے اس کو (بھلائی برائی پر مطلع کر کے) راستہ بتلایا۔" (الدھر - ۲)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اس کے دل میں ڈالی"۔ (الشمس-۸)

لیکن مال و دولت کی حرص اور بے جا نفسانی خواہشات کے جنون نے اس کی فطرت ایسی مسخ کر دی ہے کہ وہ عقل و فہم رکھتے ہوتے بھی اس قدر گمراہ ہو گیا ہے کہ قبول حق کی استعداد ہی کھو بیٹھا۔

"اور کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔ اور خدا تعالےٰ (نے) اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے۔ اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو ایسے شخص کو کون ہدایت کرے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟" (الجاثیہ-۲۳)

اس خرابی کی بنیادی وجہ آخرت کا انکار یا آخرت سے غفلت ہے ورنہ انسان اپنے انجام کی فکر ضرور کرتا۔

"مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے (بلکہ) تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو، حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے۔ (الاعلیٰ ۱۶-۱۷)

اللہ تعالےٰ نے یہ جتا دیا ہے کہ مال و دولت کی اس کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ایک آزمائش ہے اور امتحان ہے تاکہ معلوم کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا وفادار اور باغی کون ہے۔

"تمہارے مال اور اولاد کچھ نہیں، ایک فتنہ ہے (یعنی آزمائش) اور (جو کوئی مال اور اولاد ہوتے ہوتے اللہ تعالےٰ کو نہ بھولے تو) اللہ کے پاس (اس کے لئے) بڑا ثواب ہے۔" (التغابن-۱۵)

اور سورۃ الکہف میں ہے:

"ہم نے جو کچھ زمین پر بنایا اس کی رونق کے لئے بنایا اس لئے کہ ہم لوگوں

کو جانچیں، ان میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔"

درحقیقت مال اور اولاد کی کثرت ایک ایسی جان لیوا مصیبت ہے کہ انسان اگر دن رات معاشی مصروفیت ہی کو اپنا شعار بنائے اور ہر وقت مال اور اولاد ہی کی فکر میں ڈوبا رہے تو یہ مصروفیت اور حرص و طمع اسے اخلاقی پستی اور فتنہ و فساد کے جال میں پھنسا دے گی اور یہ فکر و جنون اسے متکبر اور اپنے خالق کا سرکش بنا کے چھوڑے گا اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔

" اور ان کے مال و اولاد (کی کثرت) پر تعجب نہ کیجئے۔ اللہ تعالےٰ اور کچھ نہیں یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں ان چیزوں کا عذاب ان کو لگا دے اور جب ان کی جان نکلے تو کفر ہی کی حالت میں نکلے۔" (التوبۃ - ۵۸)

اِس بے راہ روی کی ایک وجہ مغربی نظام ہے، جس نے لوگوں کا رجحان مادہ پرستی کی طرف راغب کر دیا۔ مغربی فکر و نظر میں دنیوی خوشحالی اور جسمانی تسکین پر ہی توجہ مرکوز رہتی ہے۔ کیونکہ اِس میں قرآن و احادیث کی تعلیمات اور آخرت کی زندگی کے معاملات سے روشناس کرانے کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ لہٰذا نئی نسل کو اسلامی فکر و شعور کے متعلق یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ایک فرسودہ تصور ہے۔ چنانچہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اسلامی اور روحانی اقدار کا یا تو سرے سے ہی منکر ہے یا ان کا خیال ہے کہ مذہب کا تعلق صرف آخرت سے ہے۔ اِس لئے اِس مغرب زدہ گروہ کو وہ تمام مادی فلسفے معاشی نظریے اور سیاسی نظام نہایت دلآویز اور دلفریب نظر آتے ہیں جن میں معاشی فلاح، فکر و عمل کی آزادی، نفسانی خواہشات کے حصول میں آسانی اور مذہبی معاشرتی اور اخلاقی پابندیوں اور بندھنوں سے چھٹکارا پانے کی منصوبہ بندی کے سبز باغ دکھائے گئے ہوں۔ آخرت کی بات کرنے والوں کو قدامت پسندی کا طعنہ دے کر تحقیر کی جانے لگی ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو یہ اعلان حق سنکر عبرت پکڑنی چاہیئے۔ ارشاد فرمایا:

"اور اِس (روز جزا کو) تو وہی شخص جھٹلاتا ہے، جو حدِ (عبودیت) سے گذرنے والا ہو (اور) مجرم ہو (اور) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتیں تو یوں کہدیتا ہے کہ اگلوں سے منقول چلی آتی ہیں - ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ ان کی تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے - ہرگز ایسا نہیں، یہ لوگ اس روز (آخرت کو ایک تو) اپنے رب (کے دیدار) سے روک دیتے جائیں گے - پھر (دوسرے یہ کہ) یہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔"
(سورۃ التطفیف ۱۲ تا ۱۶)

آخرت سے غافل ہو کر مال کی ہوس کرنے والوں کا انجام یہ ہے:

"ہلاکت ہے ہر طعنہ زنی اور عیب چینی کرنے والے کیلئے جس نے مال سمیٹا اور گن گن کر رکھا - اس کا گمان ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ رہے گا - ہرگز نہیں ہڈیوں کو چٹخا دینے والی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔" (سورۃ ہمزہ)

اِس مادی اندازِ فکر کو اِسلامی ممالک میں مسلمانوں کی معاشی اور اخلاقی زبوں حالی سے بہت تقویت پہنچی - بالخصوص مسیحی، یہودی اور لادینی فرقوں نے ان کی اِس کمزوری سے بیحد فائدہ اٹھایا اور اِسلام سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کی باقاعدہ اور منظم مہم چلائی، جس کے مضر نتائج تو بہرحال برآمد ہونے تھے - چنانچہ بہت سے انسانوں بالخصوص مسلمانوں کی تو عقل ہی مفلوج ہو کر رہ گئی - اس کا اندازہ اِس حقیقت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آج کل تمام اِسلامی ملکوں میں غیر ملکی عناصر نے ریشہ دوانیوں کا جال پھیلا رکھا ہے - دشمن پڑوسی اِسلامی ممالک کی جغرافیائی حدود میں داخل ہو کر جب چاہتا ہے تباہ کن وار کر جاتا ہے - لیکن مسلمانوں پر موت کا سا سکوت طاری ہے - اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جن کے ایماء پر یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے، ہم اُن پر ہی اپنا وجود قائم رکھنے اور اپنی آزادی کا تحفظ کرنے کے لئے سہاروں کے متمنی ہیں

نتیجہ یہ ہے کہ اب ان چیرہ دستیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

غرضیکہ مسلمان اب اس قدر غافل ہوگیا ہے کہ وہ یہ سوچتا ہی نہیں کہ اِس وسیع کائنات میں اِس کا بھی کوئی مقام ہے۔ آخر یہ دنیوی زندگی گذارنے کے بعد اس نے کہاں جانا ہے۔ اور اِس کی منزل کہاں ہے۔ کیا اس کی تخلیق کا مقصد محض پیدا ہونا، کچھ کھانا پینا، عیش کرنا اور پھر مر کر نیست و نابود ہو جانا ہے۔ یا اِس سے کوئی اور بلند تر اور قابل قدر نصب العین بھی ہے؟ کیا خالقِ کائنات نے اس کے لئے کوئی ضابطہ حیات بنایا ہے؟ کوئی ڈیوٹی اس کے سپرد کی ہے اگر کی ہے تو پھر اِس کو بخوبی انجام نہ دینے، یا قطعی انکار کر دینے یا سرکشی کی صورت میں کیا نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کی عقل و فہم اور اس کا ضمیر اس کو اِن سوالات کے جوابات دینے میں درست رہنمائی کرے تو اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ سرکشی اور نافرمانی کے نتائج یقیناً نہایت تلخ اور مہلک ہی ہوں گے اور ہو رہے ہیں۔

یہ سراسر غلط ہے کہ اسلامی نظام حیات میں ایسی کوئی پابندی ہے کہ رزق حلال نہ کماؤ یا مادی وسائل سے بالکل بے نیاز ہو جاؤ۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ سائنسی اور تکنیکی علوم حاصل نہ کرو۔ اِس کے برعکس بقول علامہ علاؤ الدین صدیقی حقیقت یہ ہے کہ:

"اسلام تو تعلیمات کا منبع ہے، جو نباتات اور جمادات سے لیکر سیاسیات اور اخلاقیات تمام علوم کو احاطہ کرتا ہے۔ اور اپنے ماننے والوں کو تحقیق و تجسس کا سبق دیتا ہے۔"

اِسلام کا تو نظریہ ہی یہ ہے کہ جس طرح رب العالمین نے تمام کائنات انسانیت کے فائدے کیلئے تخلیق فرمائی اسی طرح ہر انسان دوسرے انسانوں کی بھلائی اور خدمت

کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل بروئے کار لائے اور ان کی بہتری کے لئے مفید نتائج مرتب کئے جائیں۔ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ یہ سارے کام ایک مربوط ضابطے کے تحت انجام دیئے جائیں اور مقررہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ کیونکہ یہ معاشی مصروفیات تو انسان جسقدر چاہے بڑھاتا چلا جائے۔ آرزوئیں اور خواہشات کی کوئی حد نہیں۔ اس کا دائرہ تو وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن نفس تو پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اور اس کے مطالبات جاری رہتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:

"اور (اللہ تعالےٰ نے) اس کو کثرت سے مال دیا اور پاس رہنے والے بیٹے (دیئے) اور سب طرح کا سامان اس کے لئے مہیا کر دیا۔ پھر بھی اِس بات کی ہوس رکھتا ہے کہ (اس کو) اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں (اصل بات یہ ہے کہ) وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔ اس کو عنقریب (یعنی مرنے کے بعد) دوزخ کے پہاڑ پر چڑھاؤں گا۔" (المدثّر ۔ ۱۲ تا ۱۷)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

"تو وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی (یعنی دنیوی رنگ رلیوں میں ڈوبا رہا) تو بے شک جہنم اس کا ٹھکانا ہے اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو ہوا و ہوس سے روکا، تو بیشک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔" (النّٰزعٰت ۔ ۳۷ تا ۴۱)

اور سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا:

"یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی، تو نہ اُن پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ اُن کی مدد ہی کی جائے۔" (البقرہ ۸۶)

حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" اگر آدم کے بیٹے کے پاس دو وادیاں مال و دولت سے بھری ہوئی ہوں پھر بھی وہ چاہے گا کہ اس پر تیسری کا اور اضافہ ہو جائے ۔ آدمی کا پیٹ تو قبر کی مٹی ہی بھرے گی، لیکن جو توبہ کرے اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا"۔ (مشکوٰۃ شریف)

اور یہ رویہ اس حقیقت کے باوجود اختیار کیا جا رہا ہے جب کہ اللہ تعالےٰ نے جتا دیا ہے کہ مال و دولت کی اس کے ہاں ذرہ برابر بھی قدر نہیں ہے ۔ ارشاد فرمایا :

"اے نبیؐ ۔ آپ ان سے کہدیجئے کہ دنیا کا سرمایہ تو بہت ہی قلیل ہے ۔ یہ دنیوی زندگی بس چند دنوں کے استعمال کے لئے ہے اور آخرت ہی اصل رہنے کی جگہ ہے ۔"

چنانچہ ایک حدیث میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ تنبیہہ فرمائی کہ "جو شخص دنیا کو محبوب و مطلوب بنائے گا، وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کریگا پس عقل و دانش یہ ہے کہ فانی دنیا کے مقابلہ میں باقی کو اختیار کیا جائے"۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ " ہر امت کے لئے کوئی خاص آزمایش ہوتی ہے اور میری امت کی خاص آزمایش مال ہے (ترمذی) اس لئے آپؐ نے اپنی امت کے لئے اس اندیشہ کا اظہار فرمایا کہ " میں تم پر فقر و فاقہ آنے سے نہیں ڈرتا مگر مجھے تمہارے بارے میں یہ ڈر ہے کہ دنیا تم پر وسیع کر دی جائے (یعنی مال دار نہ ہو جاؤ) جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر کیگئی تھی ۔ پھر تم اس کو بہت چاہنے لگو ۔ جیسے کہ انھوں نے اس کو بہت زیادہ چاہا تھا ۔ اور پھر وہ تم کو برباد کر دے ۔ جیسے کہ اس نے اپنے اگلوں کو برباد کیا "۔ (متفق علیہ، بخاری و مسلم)

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس آدمی کی زندگی کو قابل رشک قرار دیا ہے ۔ "جو مال اور عیال کے اعتبار سے سبک، نماز کے اعتبار سے خوش نصیب اور مخفی عبادت کرتا ہو، لوگوں میں گمنام ہو، اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہ کیا

جائے، روزی صرف کفایت کے درجہ کی ہو، جس پر وہ صابر اور قانع ہو"۔ (صحیح مسلم)
ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

"جو شخص اِس حال میں صبح کرے کہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو، تندرست ہو، ایک دن کے کھانے کا سامان اس کے پاس ہو، تو گویا اس کے لئے دنیا کی نعمتیں جمع کر دی گئیں اور اسے ساری دنیا دیدی گئی۔"

یہی وہ انداز فکر تھا جس نے صحابہ کرامؓ کو جاہ و حشم سے بے نیاز کر دیا تھا، وہ دوسروں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی فکر میں رہتے۔ اور وہ بھی کسی دنیوی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے رب کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے۔ وہ تو آخرت کے دن کی جواب دہی کی فکر سے پریشان رہتے تھے۔ جس روز ساری دنیا کی دولت دے دینے سے بھی جان نہیں چھوٹ سکے گی اور نہ کسی کی سفارش ہی کچھ کام آئے گی۔ وہاں تو صرف اعمال صالحہ ہی کی پوچھ ہو گی کہ خلیفۃ الارض کی حیثیت سے نظام کائنات کیسے چلایا۔ حقوق العباد کس طرح ادا کئے۔ اللہ کے بندوں کی خدمت میں کتنی ایثار و قربانی کی۔ خود کتنی برائیوں سے پرہیز کیا اور کتنے نیک اعمال کئے۔ دوسروں کو برائیوں سے کتنا روکا اور کتنی بھلائیوں کی ترغیب دی۔ اللہ کے راستہ پر چلنے والوں کے لئے رکاوٹ تو نہیں بنا۔ فتنہ و فساد تو نہیں برپا کیا۔ دوسروں کے مال ناجائز طریقوں سے تو نہیں کھا گیا، کم تو نہیں تولا، اشیاء میں ملاوٹ تو نہیں کی۔ پڑوسیوں کو تنگ تو نہیں کیا۔ کسی کی عزت و آبرو پر ڈاکہ تو نہیں ڈالا۔ رشوت اور طمع نفسانی کیخاطر عدل و انصاف میں کوتاہی تو نہیں کی۔ اللہ اور اِس کے رسول کے احکام سے سرکشی تو نہیں کر بیٹھا، اپنے خالق کا باغی تو نہیں بنا۔ جہنم کی آگ سے اپنے اہل و عیال کو کہاں تک بچایا، وغیرہ وغیرہ۔

مغربی تعلیم نے یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ مذہب انسان کا صرف انفرادی مسئلہ ہے۔ معاشرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور اسلام بھی صرف چند رسومات اور عبادات کا نام ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا دین ہے جس کا تعلق انسان کی پوری زندگی اور ساری انسانیت سے ہے اور آخرت محض اس زندگی کا نتیجہ اور ثمر ہے۔
اگر کسی کو خوفِ خدا اور آخرت میں دنیوی اعمال کی پرسش پر کامل یقین نہ ہو تو پھر پاکیزہ خیالی، حسن عمل، اعمال صالحہ اور اخلاقی قدروں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا یہ اسی وقت ممکن ہے جب اللہ تعالےٰ کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ وہی ساری کائنات کا حاکم اعلیٰ ہے اور اسی کا حکم ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ اور ہر شخص ایک مقررہ وقت (یعنی روز قیامت) پر اپنے اچھے اور برے اعمال کا جواب دہ ہو گا۔ یہ احتساب کا ڈر ہی تو ہے جو انسان کو ہر فتنہ و فساد سے اجتناب کر کے امن و سلامتی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ورنہ ہر شخص چنگیز اور ہلاکو بن کر پوری انسانیت کو بلکہ سارے معاشرتی اور تمدنی نظام ہی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ جس طرح شاہراہوں پر ٹریفک کی کچھ پابندیوں کا نظام نافذ نہ ہو تو مہلک حادثات سے دوچار ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح شاہراہِ حیات پر چلنے والوں کے لئے بھی کچھ حدود کا تعین فطری تقاضا ہے جس کے بغیر یہ زندگی کا سفر بہت پر خطر ہے
حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم پر لازم ہے کہ تم خدا کے احکام کی پیروی کرو۔ جس چیز کو اس نے حلال کیا اس کو حلال کرو۔ جو اس نے حرام کیا اسے حرام کرو۔ اللہ نے چند فرائض مقرر کئے ان کو ضائع نہ کرو۔ کچھ حدیں مقرر کیں ان کو نہ توڑو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔"

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ :

"اہلِ ایمان وہ لوگ ہیں جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے منع کرتے ہیں۔ اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرتے ہیں۔ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہیئے کہ اس کو ہاتھوں سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے۔"

رب کریم کی یہ مہربانی ہے کہ وہ ہماری نافرمانیوں اور ہماری سرکشیوں پر فوراً نہیں پکڑتا بلکہ اصلاح کے لئے پورا موقع دیتا ہے۔ لہٰذا جب تک ہماری زندگی باقی ہے ہمیں مہلت ہے کہ اپنی سوچ اور اپنے زاویۂ فکر و نظر کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھال لیں۔ کیونکہ اللہ جل شانہٗ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیّبہ کو بہترین نمونہ قرار دیا ہے اور بہت پسند فرمایا ہے۔ اس لئے سب لوگوں کو اسی نمونہ کے مطابق زندگی گذارنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ
وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

(الممتحنہ : ۶)

بے شک ان لوگوں میں تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ (کے سامنے جانے) اور قیامت کے دن (کے آنے) کا اعتقاد رکھتا ہو اور جو شخص (اس حکم سے) روگردانی کرے گا تو (اسی کا ضرر ہوگا کیونکہ) اللہ تعالےٰ بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

لہٰذا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح سادہ اور پاکیزہ اسلامی زندگی اختیار کرنا انسانیت کی فلاح کی ضامن ہے اور زندگی کے تمام مسائل کا بھی بہترین حل یہی ہے۔ اِس سے یکسانیٔ کردار اور حسنِ عمل پیدا ہوگا۔ جس سے اجتماعی زندگی میں تضاد اور ٹکراؤ کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ اور احترامِ انسانیت، باہمی محبت و رواداری اور

امن وسلامتی کا ماحول پیدا ہو جائے گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: اَلْخَلْقُ کُلُّهُمْ عِیَالُ اللہِ۔ کی تعمیل کرنا آسان ہو جائے گا۔ جب ہر انسان دوسرے انسان کو اپنا بھائی سمجھنے لگے گا تو ایثار و خدمتِ خلق کا شعور پروان چڑھے گا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضے بطریق احسن پورے کرنے کی رغبت ہوگی اور اللہ تعالےٰ کی ہدایت پر چلنے کی تحریک ایک عالمگیر تنظیم کی صورت اختیار کر سکے گی۔ اور پھر امتِ واحدہ کا خدائی ارشاد پورا ہو کر رہے گا۔ ایسی ہی حسین زندگی حسنِ اخلاق اور صالح و پُر امن معاشرہ کے قیام کے لئے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا اور یہی وہ مشن ہے جس کو امت مسلمہ نے قیامت تک جاری رکھنا ہے تاکہ اللہ تعالےٰ کی بلاشرکت غیرے کبریائی ساری دنیا میں سربلند ہو جائے۔

"کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (دین اسلام) کو اپنے مونہوں سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔ حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا۔ اور اللہ ایسا ہے جس نے اپنا رسولؐ ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ وہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکوں کو بُرا ہی معلوم ہو۔"

لہٰذا اس مشن کی کامیابی کے لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے نفس کو تمام روحانی بیماریوں سے نجات دلانا ہوگی۔ کیونکہ بیمار ذہن کا فکر و عمل بھی غیر صالح ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہ تو صحت مند نشو ونما ممکن ہے۔ اور نہ ہی صالح اعمال اور فرائض منصبی ادا کرنے کی صلاحیت ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اس لئے اس کو ایمان کی روحانی غذا مسلسل پہنچانے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اور اس کا تعلق اپنے خالق اور رب کے ساتھ قائم کرنا ہوگا۔ سورج کی روشنی کے سامنے آئے بغیر نفس کی ظلمتیں دور ہونا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ سے محبت اور اپنی نفسانی خواہشات، آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کر کے اس کی مرضی پر چلنے ہی سے اس چمن حیات میں بہار آئے گی۔

"بے شک مراد کو پہنچا جس نے اُسے (یعنی نفس کو ستھرا اور پاکیزہ کیا (برائیوں سے) اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا۔ (الشمس - ۹)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"اصل یہ ہے کہ وہی نجات پاتا اور کامیابی حاصل کرتا ہے جو اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اور اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔" (الاعلیٰ - ۱۳ تا ۱۵)

لیکن ایسی نصیحت صرف اُسی خوش نصیب کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جو خوف خدا رکھتا ہو اور آخرت سے ڈرتا ہو۔

"وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے۔ اور جو شخص بدنصیب ہو وہ اِس سے گریز کرتا ہے جو (آخرکار) بڑی آگ میں (یعنی آتش دوزخ میں) داخل ہوگا۔ پھر نہ اس میں مرہی جلئے گا اور نہ (آرام کی زندگی) جیئے گا۔ بامراد ہوا جو شخص (قرآن سنکر خباثتِ عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا اور اپنے رب کا ذکر کرتا اور نماز پڑھتا رہا۔" (الاعلےٰ - ۱۰ تا ۱۵)

گویا تزکیہ نفس، ذکر الٰہی اور نماز وہ چند بنیادی رہنما اصول ہیں جن پر ایک کامیاب اور پاکیزہ زندگی کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ تزکیۂ نفس سے خیالات کی تطہیر اور سوچ درست ہوگی۔ ذکر الٰہی سے اللہ تعالےٰ سے تعلق استوار ہوگا اور اطاعت میں آسانی پیدا ہوگی اور نماز سے فواحش و منکرات سے نجات نصیب ہوگی۔

اِسی طرح دینِ اسلام میں روزہ کی اہمیت کا اندازہ لگایئے کہ اس کے ذریعہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے کتنے بیش بہا ذرائع موجود ہیں۔ نماز، زکوٰۃ اور حج ایسی عبادتیں ہیں جس کی ادائیگی کا ہر شخص کو پتہ چل سکتا ہے لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا حال خدا اور روزے دار کے سوا کسی دوسرے شخص پر ظاہر

نہیں ہو سکتا۔ اس عبادت سے خوف خدا اور پرہیزگاری کا جذبہ ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے دل میں خوفِ خدا جاگزیں ہو جائے وہ احکامِ الٰہی کے خلاف کوئی کام کرنے پر کب آمادہ ہو گا۔ اس کے دل میں محاسبہ کا خوف اُسے ہمیشہ نیکیوں پر اکسائے گا اور راہِ حق پر قائم رکھے گا۔ ایسا شخص نہ صرف اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کو سنوارے گا بلکہ دوسرے کے حق میں بھی رحمت ثابت ہو گا۔

علاوہ ازیں روزہ سے ضبط نفس کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نفسانی خواہشات پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے اور شترِ بے مہار ہو کر ننگِ انسانیت بننا گوارہ نہیں کرتا۔ روزے دار فرمانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق اپنے روزہ کو شیطان، دنگے فساد، گالی گلوچ، غیبت اور جھوٹ کے خلاف بطور ڈھال استعمال کرتا ہے اور محبت الٰہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کا ایسا طالب بن جاتا ہے کہ اب وہ حرام تو کجا، حلال اور جائز باتوں سے بھی روزہ کی حالت میں رک جاتا ہے۔ وہ غرباء کی بھوک اور پیاس کی اذیتوں کو محسوس کر کے انکی تکالیف دور کرنے کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اور اِس کے اندر ایثار، ہمدردی اور رحم کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ نیز حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی روزے دار کا روزہ افطار کرانا گناہوں کی بخشش اور دوزخ کی آگ سے گردن چھڑانے کا ذریعہ ہے اور روزہ کے برابر ثواب ملنا اِس کے علاوہ ہے۔ چنانچہ ہر روزہ دار یہ فائدے حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس طرح ایک ماہ کا یہ سالانہ تربیتی کورس اصلاح معاشرہ کے لئے گوناگوں حکمتوں اور فوائد کا حامل ہے۔ روزہ انسان کی اصلاح کر کے اعلیٰ مقصد کے حصول کی توانائی بخشتا ہے افراد کی اِس طرح روحانی تربیت معاشرہ کو خود بخود پاکیزہ بنا دیگی۔ بس شرط صرف یہ ہے کہ انسان یہ کام ایمان داری اور خلوص سے کرے اور نیت اللہ تعالےٰ کو

بہرصورت راضی کرنے کی ہو۔ ورنہ ریاکاری بے نتیجہ ثابت ہوگی۔ لوگوں کو مال کی ہوسناکیوں اور نفسانی خواہشات کو کم کرنے کی ترغیب بھی اسی طرح دینا ہوگی، جس طرح کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ کرامؓ کی تربیت فرمائی تھی آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا تھا کہ:

"دنیا میں ایسے رہ کہ جیسے تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا ہوا مسافر" (بخاری)

آجکل ہمارا یہ حال ہے کہ ہر وقت دنیا کا سامان اکٹھا کرنے میں لگے ہوتے ہیں جس طرح ہو سکے ہم لوگوں سے چھین جھپٹ کر روپیہ بٹورنا چاہتے۔ ساری زمین ہتھیانا چاہتے ہیں۔ اچھے اچھے مکان اور سب سے عمدہ لباس کے لئے تگ و دو جاری رہتی ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۃ التکاثر کی تلاوت کے بعد فرمایا تھا کہ "آدمی کہتا رہتا ہے میرا مال، میرا مال، کیا آدمی کا مال اتنا ہی نہیں جتنا وہ کھا کر ختم کردے، یا پہنکر پرانا کردے یا صدقہ دیکر آخرت کے فائدے کے لئے بھیج دے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ اپنے ماموں ابو ہاشم کے پاس بیمار پرسی کے لئے گئے۔ ابو ہاشم ان کو دیکھ کر رونے لگے۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ "قصہ یہ ہے کہ ہم لوگوں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بات کہی تھی اس بات پر میں نے عمل نہیں کیا۔ انھوں نے پوچھا وہ کیا بات تھی؟ بولے میں نے آپ کو کہتے سُنا کہ مال جمع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے ایک خادم اور اللہ کی راہ میں کام کرنے کے لئے سواری کا ایک گھوڑا کافی ہے۔ اور میں اب دیکھ رہا ہوں کہ میں نے مال خوب جمع کر لیا ہے"۔ (مشکوٰۃ)

حضرت علے کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی آدمی کے مال میں برکت نہیں دیتا، تو وہ اسے پانی اور مٹی

میں ملا دیتا ہے ۔" (مشکوٰۃ) یعنی ایسا انسان اپنا مال بلاضرورت اونچی اونچی عمارتیں بنا کر اینٹ اور گارے کی نذر کر دیتا ہے اور اس طرح وہ مٹی کا ڈھیر بن جاتا ہے ۔

انسان عام طور پر کسی کو مالدار یا اس کا دنیوی جاہ و جلال دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ بڑا خوش نصیب ہے اور اللہ تعالیٰ کا منظور نظر ہے کہ ہر خواہش اس کی پوری کی جا رہی ہے ۔ مگر اِس کی حقیقت کچھ اور ہی ہے ۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"جب تو دیکھے کہ اللہ عزوجل کسی آدمی کو باوجود اس کے کھلم کھلا گناہوں کے دنیا کی نعمتیں اور مال و جاہ دے رہا ہے اور وہ جو چاہتا ہے اس کو مل جاتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ اس کو رفتہ رفتہ گناہوں میں بڑھایا جا رہا ہے تاکہ آخر میں اسے سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے اسکے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی :-

" پس جب وہ ان باتوں کو بھول گئے جو انھیں یاد دلائی گئی تھیں ۔ تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے ۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے مال وجاہ پر اترا گئے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ بے بس ہو کر رہ گئے " (مشکوٰۃ)

دنیوی مال و دولت تو نیک و بد، مومن اور کافر کسی پر بند نہیں ، وہ تو سب کو عطا کی جاتی ہے ۔ لیکن اِس کا وبال انسان کو دوزخ میں لے جا کر ہی دم لیتا ہے ۔ ارشاد فرمایا :

"جو شخص دنیا (کے نفع) کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے ۔ پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے ۔ وہ اس میں بدحال راندۂ (درگاہ) ہو کر داخل ہوگا ۔" (بنی اسرائیل ۔ ۱۸)

آگے چل کر فرمایا:

"آپ کے رب کی (اس) عطا (دنیوی) میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی۔ اور آپ کے رب کی یہ عطا (دنیوی کسی پر) بند نہیں۔ آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے۔" (بنی اسرائیل ۲۱-۲)

لیکن یہی دولت مند اور امیر لوگ اپنی دولت کے نشے اور غرور میں اپنے علاقہ کے لوگوں پر ایسے ظلم توڑتے ہیں جو بالآخر خود اپنی بلکہ ساری بستی کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے رئیس و امیر لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں، تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ پھر اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں۔" (بنی اسرائیل - ۱۶)

دولت کی حرص کی بیماری کا علاج بھی اللہ تعالےٰ نے ہمیں بتلا دیا ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ ابن آدم سے کہتا ہے۔ سب طرف سے ہٹ کر میری طرف عبادت میں لگ جا۔ میں تیرے دل کو تونگری سے بھر دوں گا اور تجھے کسی کا محتاج نہ ہونے دوں گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیرے ہاتھوں کو مال سے تو بھر دوں گا لیکن تیری محتاجی کو دور نہ کروں گا۔"

ایک اور حدیث میں ہے جسے حضرت ابو الدرداءؓ نے روایت کیا۔ آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سورج کبھی نہیں نکلتا مگر اس حال میں کہ اس کے دونوں طرف دو فرشتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں اور ان کی آواز انسان اور جن کے سوا تمام مخلوق سنتی ہے۔ اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ، تھوڑا مال جو کفایت کرے، زیادہ مال سے بہتر ہے کیونکہ وہ غافل کر دیتا ہے۔" (مشکوٰۃ شریف)

لہٰذا ایسی تجارت کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے ۔جس میں مصروف ہو کر انسان خدا ہی کو بھول جائے ۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بہت بڑے تاجر تھے ۔حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "جب میرے سامنے جنت پیش کی گئی تو سب صحابہ بآسانی جنت میں داخل ہو گئے لیکن عبدالرحمٰنؓ بن عوف گرتا پڑتا چلا تو بمشکل جنت کے دروازہ تک پہنچا" یہ بات سنکر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تمام اونٹ اور غلام اللہ کی راہ میں دے دیئے اور عرض کیا کہ اب شاید میں صحابہ کے ساتھ آسانی سے جنت میں داخل ہو سکوں گا۔

بزرگانِ دین بالخصوص خلفائے راشدین بھی اس سلسلہ میں بڑی روشن مثالیں ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں ۔امیرالمومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر گھر کا سارا سامان ہی جہاد فی سبیل اللہ میں دے ڈالا۔

امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سادہ زندگی کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہو کر بھی ریت پر سو جاتے تھے ۔اور ایک مرتبہ جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ حضرت عیاضؓ جو گورنر الجزیرہ تھے ، باریک لباس پہنتے ہیں تو انھیں پکڑ کر بلوایا اور ان کے باریک کپڑے اتروا کر موٹے کمبل کا ایک کرتا پہنادیا۔ اور ایک لاٹھی دیکر کہا کہ تم انسانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو۔ اس لئے آج سے بیت المال کی ریوڑ چراؤ ۔اسی طرح فاروق اعظم نے ایک غازیِ اسلام کو قیمتی لباس پہنے دیکھا تو غضبناک ہو کر فرمایا کہ مازنؓ کے بیٹے تجھے خدا کے برگزیدہ رسول کا طرز عمل پسند نہیں جو حضور کو مرغوب تھا ۔جو روپیہ اس لباس پر صرف کیا وہی اگر غرباء و مساکین پر خرچ کیا جاتا تو کیا حرج تھا۔

غرضیکہ حضورؐ کا یہ وہ طریقہ تربیت تھا جس سے عربوں جیسی پسماندہ قوم میں بھی ایک عظیم انقلاب آگیا اور محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ "خدا کی قسم دعوت

اسلام کا جو کام ہوا ہے پایۂ تکمیل کو پہنچ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ صنعا (یمن) سے حضر موت تک مسافر چلا جائے گا اور اسے کسی کا کھٹکا نہ ہوگا۔"

اسلام کے اصولوں سے انحراف کر کے اقوام عالم نے دیکھ لیا کہ انھیں جرائم میں اضافے، لوٹ مار، فسق و فجور، اخلاقی پستی، انتشار، ہنگامہ آرائی، خود غرضیوں اور خانہ جنگیوں کے سوا کیا حاصل ہوا۔ آج دلوں کا چین اور ذہنی سکون کہیں نصیب نہیں۔

توُ نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

لیکن اس کے برعکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے انسانوں کے خیالات و جذبات کی اس طرح تطہیر فرمائی کہ لوگوں کے دلوں میں عدل و انصاف، اخوت اور ایثار و ہمدردی کے جذبات اس طرح موجزن ہو گئے کہ زن، زر اور زمین کی ہوس بالکل جاتی رہی۔ اور یہ اسلامی معاشرہ اتنا خوشحال ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے مدینہ کی گلیوں میں سونا لیکر صدقہ و خیرات کے لئے نکلتے اور حاجت مندوں کو پکارتے مگر کوئی حاجت مند نظر نہیں پڑتا تھا۔ سب آسودہ حال ہو گئے تھے۔ انصار مدینہ نے مکہ کے مہاجرین کے لئے جو بے مثل ایثار و قربانی کی وہ سب پر عیاں ہے۔ انھوں نے تو اپنی بیویوں تک کو طلاق دیکر مہاجرین کے نکاح میں دے دیں۔

اسلام کی تعلیم نے فرد کے ضمیر کو اس طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا کہ خطاکار بھی اللہ تعالےٰ کے قانون کے نفاذ کے لئے خود رحمت اللعٰلمین کی خدمت میں پیش ہو کر اپنے اوپر تعزیری حد کے لئے اصرار کرتے تھے۔ مثلاً ایک شخص ماعز بن مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھے پاک کر دیجئے۔ حضورؐ ٹالتے رہے لیکن وہ اصرار کرتا رہا اور سوال کرنے پر کہا کہ زنا سے پاک کر دیجئے۔

رسول اللہؐ نے پوچھا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ہے۔ شراب تو نہیں پی رکھی۔ پھر جب پوری تسلی ہوگئی تو اس کو سنگسار کر دیا گیا۔ اسی طرح ایک عورت زنا کی مرتکب ہوئی تو دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہوکر پاک ہونے کی درخواست کی۔ حضورؐ نے اسے واپس کر دیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد آئے۔ جب بچہ پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں اٹھائے حاضر ہوکر شرعی حد کی استدعا کی۔ رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم اس کو پھر واپس کر دیا کہ بچہ جب روٹی کھانے کے قابل ہو جائے تو پھر آئے۔ وہ کچھ عرصہ بعد بچہ کو اس حالت میں لے کر حاضر ہوئی کہ وہ روٹی کھا رہا تھا اور اصرار کیا کہ اس کو پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ سنگسار کر دی گئی۔

موجودہ دور میں مجرم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن اسلام میں شرعی سزا کی حیثیت ایک حدیث سے واضح ہو جاتی ہے۔ روایت ہے کہ ایک زانی کو سنگسار کرتے وقت ایک صحابیؓ نے پتھر مارا تو اس کے خون کے چھینٹے صحابیؓ پر پڑے۔ تو انھوں نے زانی کو برا بھلا کہا تو حضورؐ نے ایسا کہنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اس کا ثواب تمام مدینہ والوں کے لئے کافی ہوگا۔

یہ ضمیر کی بیداری، یہ احساسِ شعور، یہ گناہ سے پاک ہونے کی طلب جس کا اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی واقف نہ تھا، اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام کے عقاید اور نظریات کے سبب فکر و نظر میں اللہ تعالےٰ کے قانون کا حقیقی احترام پیدا ہو گیا تھا اور اس دین کو اس کی مستحکم بنیادوں پر اور معین حدود میں قائم رکھنا جتنا حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کو عزیز تھا، اتنا ہی عام مسلمانوں کو تھا، جس میں اخلاقی مجرمان تک بھی شامل تھے۔

اس انقلاب کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں میں یہ حقیقت خوب ذہن نشین ہوگئی تھی کہ انسان کی عملی زندگی کی تمام دوڑ دھوپ دنیا کے لئے نہیں آخرت کے لئے ہے۔ انسان جو راستہ اختیار کرے گا وہی ملے گا۔ اللہ تعالےٰ کے نائب ہونے کی حیثیت

سے آخرت کی فکر کرنے کے سوا فلاح و نجات کی کوئی اور تدبیر نہیں۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔

" اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔" (بنی اسرائیل ۲۱)

اور کامیاب، بامراد بھی وہی ہو گا جو اللہ تعالےٰ کے بتاتے ہوئے راہ حق پر چلے گا۔

" اور یہ کہ یہ مرا راستہ ہے سیدھا۔ تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہ وہ راستہ تمہیں اس (اللہ) کے راستہ سے جدا کر دینگے یہ ہے جس کی اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے۔ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

(الانعام ۱۵۲ تا ۱۵۴)

اور یہ سیدھا راستہ دینِ اسلام ہے۔

" اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے، سو جو اسلام لایا تو ایسے ہی لوگ ہیں جنھوں نے سیدھا راستہ اختیار کیا۔"

ہدایت کا دار و مدار بھی صرف دین اسلام کے مطابق زندگی گذارنے پر ہے۔

" پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو بے شک وہ ہدایت پر ہونگے۔" (آل عمران۔ ۲۰)

اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے اس دین کو تمام انسانیت کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا اعلان فرمایا:

" آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام سے راضی ہوا۔" (المائدہ۔ ۳)

لہٰذا اِسی دین پر پوری طرح عمل کرنے اور اسی پر قائم رہنے کا اللہ تعالےٰ نے حکم فرمایا:

" مسلمانوں اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ۔" (البقرہ۔ ۲۰۸)

اب اگر کوئی مسلمان، ایمان لانے کے باوجود اسلام سے بھٹک جائے تو وہ خود

ہی نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائے گا۔

"اور جو شخص اسلام کے علاوہ اور کوئی دین تلاش کرے گا، تو وہ دین اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔" (آل عمران)

پس یاد رکھئے کہ اللہ تعالےٰ پر یقین کامل ہی ہمیں اس کی اطاعت پر آمادہ کرے گا۔ اس کی قدرت کا علم، دوسروں کی اطاعت سے بے نیاز کر دے گا، فکرِ آخرت، راہِ حق سے بھٹکنے نہ دے گی اور جزا و سزا کا تصور ہر فتنہ اور ہر برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ لیکن اگر ہوا و ہوس سے چھٹکارا حاصل نہ ہوا تو دین و دنیا دونوں کی تباہی یقینی ہے۔ اس لئے اگر دائمی حسین زندگی کی تمنا ہے تو نیابت الٰہی کے تقاضے پورے کرنا ہی پڑیں گے اور عتابِ الٰہی کے مقامات سے بھی اجتناب لازمی کرنا ہوگا۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ اللہ کو یاد کرلو، موت اپنی تمام سختیوں سمیت آ رہی ہے۔ یہ مال و دولت قبر میں ساتھ نہیں جائے گا۔ لہٰذا ابھی وقت ہے، رب رب کر لو اور اپنے اللہ کو راضی کرلو۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہ اسلامی تصورِ حیات ہی دنیوی اور اخروی فلاح کا ضامن ہے۔ قرآن ہی مشعلِ راہ ہے۔ برائیوں سے پاک اسلامی معاشرہ کا قیام، ہمارا مقدس دینی فریضہ ہے اور یہی جہادِ اکبر ہے۔

گر تو می خواہی، مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

چند عملی تجاویز

اصلاحِ معاشرہ کا کام بڑا مشکل اور صبر آزما ہے ۔ لیکن اگر اربابِ اختیار و اقتدار اس کام میں خلوص سے دلچسپی لیں تو بڑی آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں ۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر اربابِ اختیار کے سامنے کچھ تجاویز ہیں جن میں اکثر ایسی ہیں جنہیں مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کی تائید بھی حاصل ہے ۔ اگر ان پر غور کیا جائے اور جن تجاویز کو اپنی رائے کے مطابق قابلِ عمل اور کارآمد سمجھا جائے ان پر عمل کیا جائے ۔ تو یہ ایک بڑی قومی اور دینی خدمت ہو گی ۔

۱۔ ہمیں ایک ایسے نظامِ تعلیم کی منصوبہ بندی کرنی چاہیئے جس سے ملّتِ اسلامیہ کے مسلّم عقائد، نصب العین حیات اور موجودہ دور کے دنیوی تقاضے پورے ہو سکیں ۔ جس میں اللہ تعالےٰ سے سرکشی، اخلاقی اور روحانی قدروں سے بغاوت غیر اسلامی اور مادہ پرست تصورات اور بے جا ہوا و ہوس کے رجحان کو رفتہ رفتہ ختم کیا جا سکے ۔ اور ان کی بجائے توحید، فکرِ آخرت، اخوت، انسانی ہمدردی، ایثار و قربانی، برائیوں کے تدارک اور نیکیوں کے فروغ کا شعور بیدار ہو اور ترقی کرے ۔ اور معاشرے کو مختلف گروہوں کے درمیان کسی قسم کی طبقاتی، نظریاتی اور نفسیاتی کشمکش اور ٹکراؤ پیدا نہ ہو ۔ تاکہ ملک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے بھی محفوظ رہے ۔ اِس سلسلہ میں ہمیں ہادئ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کی مثال سامنے رکھنا ہو گی ۔ آپ نے معاشرے

کے مختلف گروہوں کو کسی طبقاتی کشمکش میں نہیں الجھایا۔ بلکہ آپؐ نے جوانوں اور بوڑھوں سے کہا کہ ادب نصف الایمان ہے جو بڑوں کا احترام نہیں کرتا اور چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔ اسی طرح آپ نے امیروں سے کہا کہ تمہارے پاس جو کچھ مال ومتاع ہے وہ سب اللہ تعالےٰ کا بخشا ہوا ہے۔ غریبوں اور مسکینوں کا تمہارے مال میں حق ہے۔ اس لئے تمہاری ضروریات پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ حقداران کو تقسیم کر دو۔ اس نوعیت کی تربیت سے یکسانیٔ فکر پیدا ہوتی اور ہر شخص کی معاشی پریشانی دور ہو گئی۔ اور ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ ہو گا۔

۲۔ دینِ اسلام کی افادیت کا احساس عام کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس پر ملکی اور ملی فلاح کا دارومدار ہے۔

۳۔ قرآن و احادیث کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا جائے۔ تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کے علاوہ اعلےٰ سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کے لئے مقابلے کے امتحانوں میں قرآن و احادیث، اسلامی قوانین اور اسلامی تاریخ کی واقفیت لازمی ہو۔ نیز سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے تمام ملازمین کے لئے تعلیمی قابلیت اور فرائض منصبی کے مطابق دین اسلام کے متعلق ایک خاص تربیتی کورس کا اہتمام کیا جائے اور اس کورس میں کامیابی کو آئندہ ترقی کے لئے ضروری شرط قرار دیا جائے۔

۴۔ عربی زبان کا سیکھنا اور بولنا ہر مسلمان کے لئے ضروری قرار دیا جائے۔ تاکہ قرآن و احادیث کا علم حاصل کرنا آسان ہو جائے۔ اس سے اتحاد بین المسلمین کو بھی بہت تقویت پہنچے گی۔

۵۔ آنحضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کو تعلیمی نظام

میں ایسے دلپذیر انداز میں شامل کیا جائے جس سے محسن انسانیت ﷺ سے والہانہ عقیدت پیدا ہو جائے ۔ اسی طرح ہر سوسائٹی میں عشق رسولؐ پیدا کرنے کے لئے خاص تحریک چلائی جائے تاکہ لوگوں میں اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا ذوق وشوق تیز ہو ۔

۶۔ تاریخ اسلام خصوصاً ابتدائے اسلام اور خلفائے راشدین کے دور کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جائے ۔ تاکہ مجاہدانہ زندگی گذارنے کیطرف رغبت ہو ۔

۷۔ اسلامی تصورات کے خلاف ہر قسم کی نشر واشاعت اور تصانیف کو ملک و ملت کے خلاف غداری کے مترادف گردانا جائے ۔ اس قسم کے غیر ملکی لٹریچر کی درآمد پر بھی مکمل پابندی عائد کر دی جائے ۔ تاکہ ملک میں فاسد اور غیر اسلامی خیالات نہ پھیلائے جا سکیں ۔

۸۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ مبلغین اسلام کی ایک خاص جماعت تیار کی جائے جنکو دوسرے ادیان پر بھی پوری دسترس حاصل ہو ۔ تاکہ غیر اسلامی فکر و نظر کے نقصان دہ پہلو اجاگر کئے جا سکیں ۔

۹۔ دین اسلام میں عدل واحسان کی افادیت کے متعلق شعور بیدار کیا جائے ۔

۱۰۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی افادیت واضح کرنے کیلئے منظم تحریک چلائی جائے ۔ زکوٰۃ ادا کرنے سادگی اور کفایت شعاری اختیار کرنے اور اصراف سے بچنے کی تلقین کی جائے ۔

۱۱۔ رزق حلال کمانے اور حرام سے اجتناب کرنے پر سختی سے عمل کرایا جائے ۔ اور ان کے فوائد و نقصانات واضح کرنے کے لئے باقاعدہ مہم چلائی جائے ۔

۱۲۔ نشر و اشاعت کے اداروں ، اخبارات و رسائل ، مساجد اور ادبی محفلوں کی تقریبات سے اسلامی تصورات کی تبلیغ اور قومی و ملکی مقاصد حاصل کرنے کیلئے

منظم طریقہ پر فائدہ اٹھایا جائے۔

۱۳۔ اسلام پر علمی تحقیقات کا شعبہ قائم کیا جائے تاکہ اسلامی تہذیب نے جو بے مثل کارنامے انجام دیئے ہیں انکو صحیح منظر میں پیش کیا جا سکے۔

۱۴۔ نوجوانوں کی سیرت و کردار کی تعمیر پر خاص توجہ دی جائے۔ اس سلسلہ میں اساتذہ کے علاوہ علما و مشائخ کرام کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جائے تاکہ وہ درس و تدریس اور ذکرِ الٰہی کے ذریعہ ان کے خیالات و جذبات کی تطہیر کر کے ان پر فکرِ آخرت کی اہمیت واضح کر سکیں اور ان کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی ڈھالنے پر مائل کر سکیں۔ مشائخ کرام کی صالح اور پاکیزہ زندگی کا عملی نمونہ بھی رشد و ہدایت حاصل کرنے کیلئے بہت سود مند اور مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ انکی خدمات سے ضرور استفادہ کیا جائے۔

۱۵۔ جو طلبہ اسلامی طریقۂ زندگی کا اعلیٰ معیار سارے سال برقرار رکھیں، ان کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے۔ اسی طرح وہ عام شہری جو اعلےٰ اخلاق کی تعمیر، بے لوث خدمتِ خلق اور ایثار و قربانی میں نمایاں خدمات انجام دیں انکی بھی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۱۶۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کو معاشرے میں مناسب اور قابل احترام مقام دیا جائے۔ ان کی معاشی ضرورتیں پوری کرنے کا فوری، بندوبست کیا جائے تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے دینی فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہر اس طالب علم کے لئے جو حافظِ قرآن ہو ماہوار وظیفہ دے کر حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس طرح سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں جو بھی ملازم حافظ قرآن ہو، اسکو خاص الاؤنس دیا جائے تاکہ دوسروں کو بھی حفظ قرآن کا شوق پیدا ہو۔ جو طالب علم اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ

رکھتے ہوں، ان کو تمام ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں۔ ان کے دینی علم سے کثیر مخلوق کو فائدہ پہونچے گا۔ اور معاشرہ کی اصلاح میں مدد ملے گی۔

۱۷۔ صنعتی اور تجارتی مراکز میں بد دیانتی، کم تولنے، ملاوٹ کرنے اور ناجائز نفع خوری کا سختی سے نوٹس لیا جائے اور شرعی سزائیں دی جائیں۔ نیز جو کاروباری ادارے یا زمیندار محنت کشوں اور کسانوں کی فلاح و بہبود اور اسلامی تعلیم و تربیت میں قابل قدر تعاون کریں انکی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۱۸۔ بچوں کی صحیح رہنمائی اور تربیت پر خاص توجہ دی جائے اور ایک جامع پروگرام مرتب کیا جائے۔ بچوں کی تنظیمیں قائم کی جائیں تاکہ عبادات کا شوق پیدا ہو اور اعلے کردار کی تعمیر ہو سکے۔ ایسے کھیل کود جس میں نوجوانوں کا زیادہ وقت ضائع ہوتا ہے حوصلہ شکنی کی جائے۔

۱۹۔ نئی نسل کی دلچسپی کیلئے ایسی ادبی مجالس اور تقریبات منعقد کرانے کا بندوبست کیا جائے جس سے مسلمانوں میں جو عظیم انسان پیدا ہوئے انکی یاد تازہ ہو۔ قومی وقار ابھرے اور قربانی و ایثار کے جذبہ کو فروغ حاصل ہو۔

۲۰۔ عوامی تقریبات میں علماء اور دینی مدارس کے اساتذۂ کرام و طلباء کو باوقار مقام دیا جائے۔

۲۱۔ بلدیاتی انتخابات کے نتیجہ میں جو فلاحی ادارے وجود میں آئیں، خصوصاً جو زکوٰۃ و عشر، اصلاح معاشرہ اور تعلیمی مسائل سے متعلق ہوں، ان میں علماء دین کو بھی موثر طور پر منسلک کیا جائے تاکہ روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ شرعی تقاضے بھی پورے ہو سکیں۔

فہرست کتب جن سے استفادہ کیا گیا

کتاب	مصنف
۱۔ کریمینالوجی	روبخٹ شوفل مکیون (نیویارک)
۲۔ جرائم اور سزاؤں کے مسائل	ہرمن منہیم (امریکہ)
۳۔ کم سن مجرم اور پولیس کا کام	جان پی کینے اور ڈان جی پرسوٹ (لندن)
۴۔ دولت کا اثر جرائم پر	پروفیسر ڈاکٹر رولینڈ گراس برگر فرانس
۵۔ جرائم اور تشدد	این۔ اے۔ فاروقی
۶۔ جرائم کے محرکات اور علاج	محمد اکبر
۷۔ تفسیر روح البیان	
۸۔ اشرف التفاسیر	مفتی احمد یار خان
۹۔ تفسیر ضیاء القرآن	مولٰنا کرم شاہ صاحب بھیرہ شریف
۱۰۔ اسلام کے بنیادی عقائد	مولٰنا ابو الاعلیٰ مودودی
۱۱۔ سیرت النبیؐ	علامہ شبلی نعمانی رح
۱۲۔ ایمان (رسالہ)	علامہ سید محمد سلیمان ندوی رح
۱۳۔ فتوح الغیب	شیخ عبد القادر جیلانی رح
۱۴۔ کیمیائے سعادت	امام غزالی رح
۱۵۔ نزولِ قرآن کا مقصد	مولٰنا احمد علی لاہوری
۱۶۔ محمد الرسول اللہؐ	شیخ محمد رضا۔ قاہرہ (مصر)
۱۷۔ شریعت و طریقت	مولٰنا اشرف علی تھانوی
۱۸۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا برپا کیا ہوا انقلاب	سید ابوبکر غزنوی

کتاب	مصنف
۱۹۔ قرآن مجید کا اصل فلسفہ	ڈاکٹر اسرار احمد
۲۰۔ زوال امت کے اسباب	امیر شکیب ارسلان (مصر)
۲۱۔ معاشرتی خرابی کے محرکات	سید محمد قطب المصری
۲۲۔ اسباب زوال امت	ساجد الرحمٰن، ادارۂ تحقیقات اسلامی
۲۳۔ زندگی کا اسلامی نصب العین	علامہ علاؤالدین صدیقی
۲۴۔ کتاب الاموال	امام ابو عبید بن سلام
۲۵۔ خطبہ صدارت اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۰ء	علامہ اقبال رح
۲۶۔ تعلیمی اصلاحات	سید ابوالحسن علی ندوی
۲۷۔ مغرب زدہ طبقے کی منفی سوچ	عبدالحمید صدیقی
۲۸۔ دلائل السلوک	مولانا اللہ یار خاں صاحب
۲۹۔ مطالعہ تہذیب اسلامی	پروفیسر محمد ارشد خان بھٹی - لاہور
۳۰۔ اسلام اور اسلامی تعلیم کا مسئلہ	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
۳۱۔ مقصد زندگی	سید اسعد گیلانی
۳۲۔ کیا کائنات اور زندگی بے مقصد ہے	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
۳۳۔ حاشیہ قرآن	مولانا نعیم الدین مراد آبادی رح
۳۴۔ "	مولانا شبیر احمد عثمانی رح
۳۵۔ کشف المحجوب	حضرت داتا گنج بخش
۳۶۔ سیرت رسول عربی	علامہ نور بخش توکل
۳۷۔ آپ کی ہستی	سید برکت علی لدھیانوی

اِرشادِ باری تعالےٰ

وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

(التوبہ : آیۃ ٦٩)

اور تم بھی بری باتوں میں ایسے ہی گھسے جیسے وہ لوگ گھسے تھے اور اُن لوگوں کے اعمال (حسنہ) دُنیا اور آخرت میں ضائع گئے اور وہ لوگ بڑے ہی خسارے میں ہیں۔

◉

...قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○ (البقرہ : آیۃ ١١/١٢)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں کہ ہم تو اِصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اسکا شعور نہیں رکھتے

◉

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ○
ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ○
كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ○

کیا ہم اگلے لوگوں کو ہلاک نہیں کر چکے۔ پھر پچھلوں کو بھی ان کے ساتھ ساتھ کر دیں گے، ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

◉